

کنوارے الفاظ کا جزیرہ

وحشی سعید

کنوارے الفاظ کا جزیرہ

(افسانے)

وحشی سعید

WEHSHI SAEED

KUNWARE ALFAZ KA JAZEERA

(NOVEL)

STAR, NEW DELHI

1983 Rs.20.00

تقسیم کار

سٹار بک سینٹر

آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ناشر: "پوش" کرن نگر، سرینگر (کشمیر)

قیمت: بیس ۲۰ روپے (Rs 20/-)

پہلا ایڈیشن: ۱۹۸۳ء

طابع: ہمگری پرنٹرز، صاحب آباد (یوپی)

میں جب بھی تنہا ہوتا ہوں !
تم میرے بہت قریب ہوتے ہو!!

"ب" کی نذر

وحشی سعید

ترتیب

کشکول ۵
آبِ حیات ۱۴
مٹھی اڑان آسمان ۲۲
آتش بیاں ۲۷
طلسم کلام ۲۹
پہچان ۳۳
خودسری ۳۵
گمراہی ۳۷
سکوت در سکوت ۳۹
نیا حکمراں ۴۳
منفی کا قائدہ ۴۸
اندراج ۵۶
اِرتقاء کا سانحہ ۶۱
آدھے ادھورے ۷۱
کرچیوں کا سفر ۷۵
اندھا کنواں ۸۰
کہانی کا آسیب ۸۵
بُت پرست ۹۰
بڑا دروازہ ۹۵
سو گئے داستاں کہتے کہتے ۱۰۰
کنوارے الفاظ کا جزیرہ ۱۰۴

کشکول

اَب بھی رنگوں میں قوسِ قزح کی لکیر
اپنی تمام رعنائیوں سے اُبھرتی ہے۔ وہ، وہ
قوسِ قزح ہے جو اُبھر جاتی ہے، کھو جاتی ہے اور
میں چپکے سے اُس کے کان میں کہہ دیتا ہوں:
"تم قوسِ قزح ہو!"
وہ اپنی بڑی بڑی، موٹی موٹی آنکھوں سے
خاموش رہنے کا حکم دیتی۔ وہی آنکھیں جن میں
درد اور کرب کی پرچھائیں نظر آتی تھیں۔ لیکن
اُن آنکھوں نے مجھے اپنی گرفت میں لیا۔ اب
...... اب میں اپنے آپ کو اضطراب،
بے چینی، بے بسی کے عالم میں تڑپتا ہوا
محسوس کرتا ہوں!

وہ کتابی چہرہ اب بھی نظر کے سامنے ہے۔ جس پر وہ موٹی موٹی آنکھیں سنجیدگی اور خاموشی کی پرچھائیاں بن کے رہ گئی تھیں۔ اس کی کمر پر بالوں کی لمبی چوٹی، اس کی صحت مند پیٹھ اور اس کے کانوں میں چمکتی اور جھولتی ہوئی بڑی بڑی جیسی بالیاں!

دو سال لمبی مدت ہوتی ہے۔۔،۔۔ دو سال پہلے سبیل کے نام شادی کی لیبل لگا کر پتھروں کی دنیا میں آ گئی۔ اُس دنیا کا عجیب اور بے ہودہ سا نام بھی تھا۔ پتھروں میں پتھر کی زندگی تھی۔ تب ہی کسی نے اس کا پیار کچھ نام رکھ دیا ہے۔۔۔۔۔ وہاں پتھر کے پھول تھے۔ بے حس۔۔۔۔ خوشبو سے عاری، اور نزاکتوں سے بے بہرہ۔ وہاں زندگی کا پھول بھی سوکھ کر کانٹا بن جاتا ہے۔

اور یہی قوس قزح کی دنیا تھی!

وہ اپنی خوشبو کھو رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ جانتی تھی اور یہی احساس جان لیوا تھا۔ کاش احساس بھی مُردہ ہو جاتا۔

ترتیب رکھنے والا سبیل ترتیب کو زندگی کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔ کالج کی جواں فضا نے ہماری دوستی پر مضبوط مہر لگائی۔ مگر سبیل میری بے ترتیب زندگی سے ہم آہنگی پیدا نہ کر سکا۔ وہ مکانوں میں رہتا تھا۔ وہ انجینیر بن گیا۔ وہ میری فاقہ مست زندگی کو کوستا تھا۔ اور میں اپنی قسمت

پر ناز کرتا تھا۔ وہ بلیو پرنٹ کی لکیروں میں کھو گیا۔
لکیروں کی دنیا لکیروں تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔
سبیل کو ان لکیروں کی نوک پلک درست کرنے سے
غرض تھی۔ مکان گر جاتے تھے بن جاتے تھے۔ یہ تو زندگی
کا کاروبار تھا۔ وہ مکانوں کو کھڑا کرنے والا انجینئر
تھا، ان کی اونچائی اور لمبائی سے واسطہ رکھتا تھا۔
قوس قزح لکیر نہیں تھی ...... مکان نہیں
وہ گم ہو گئی ...! کھو گئی ...... الجھ گئی!!
انسان انسان ہوتے ہیں۔ وہ مکان نہیں
ہوتے۔ ان میں حرارت اور جذبات ہوتے ہیں۔
دل اور خواہشات ہوتے ہیں۔ ان کے مزاج اینٹ اور
پتھر نہیں ہوتے۔ سبیل کی دنیا میں پتھر
توڑے جاتے ہیں۔ گاڑھے سے سجائے جاتے ہیں،
اپنی دنیا میں اکیلی اکیلی قوس قزح ...... اکیلی تھی،
سبیل کی زندگی متوازن خط تھی ...... وہ کوئی
منحنی لکیر کا رکھوالا نہیں تھا۔

اپنی فاقہ مست زندگی نے مجھے خیالوں میں لیا۔
میں ادیب بن گیا۔ جو رنگوں کی دنیا میں رہتا ہے۔
رنگوں سے پیار کرتا ہے، رنگوں سے لفظوں کے پیکر
تراشتا ہے۔ اور وقت ...... وقت انوکھا ہوتا
ہے۔ ...... وقت نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔ سونا
بنا دیا ...... سونے سے تولا ادب سے اچھے پیسے
وصول ہوئے۔ مگر اپنی الجھی دنیا میں پیچ و خم رہے۔

...... سلجھانے والا جو نہ ملا۔ مگر میں کب اس الجھی ہوئی
دنیا سے خوفزدہ ہوا۔۔ گھبرایا۔ یا۔ ڈر گیا۔۔۔
مجھے اپنی وحشت سے پیار تھا، لگاؤ تھا۔
پھر ایک دن اچانک میرے ہاتھ ایک خط
لگ گیا۔
یہ اینٹوں اور پتھروں کی دنیا سے آیا تھا،
سبیل نے مجھے اس دنیا میں چند دنوں کے لئے آنے
کو کہا تھا۔ میں جانتا تھا، وہاں رنگ تھے......
اچھے بھی، برے بھی! خوبصورت اور...... بھدّے!
..... رنگوں کی اس ترتیب میں نیلوفر، زاہدہ اور
فریدہ تھیں۔ اور سبیل کو ان رنگوں کو بکھیرنے
کے لئے برش چاہیئے۔ میں رنگوں میں سے تصویروں
کو ترتیب دیتا ہوں۔ پھر ایسے رنگ جو چھوٹے
نہیں گئے، پر کھے نہیں گئے۔ جن کی نزاکتوں اور دلفریبیوں
میں کوئی الجھ نہیں گیا تھا۔ سبیل کی ان تین بہنوں میں
مجھے کسی ایک کا دامن تھام لینا تھا۔ ... مگر قوس قزح..
...... وہ قوس تھی...... قزح تھی۔ اس تک
پہونچنے کے لئے لاکھوں میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے
.... قوس قزح کے سامنے ان کی نزاکتیں اور ادائیں
ماند پڑ جاتی ہیں۔ اس لئے قوس قزح دل و جگر میں
اتر گئی۔ میں نے چپکے سے اس کے کان میں کہا:
"تم قوس قزح ہو......!"

وہ خاموش رہی۔ خاموشی اُس کا ہتھیار تھا۔ خاموشی ہی اُس کا حربہ تھی۔ مگر زندگی خاموش نہیں تھی.... ہل چل تھی.... بھاگ دوڑ تھی۔ جدّوجہد تھی۔ مگر وہ کورا کاغذ تھی.... میں نے چاہا.... بہت چاہا.... وہاں لکیریں کھینچ دوں.... اتنی ساری لکیریں کہ وہ گنتے گنتے تھک جائے اور میں لکھتے لکھتے رُک جاؤں۔

مگر اُس کا کورا جواب سرحد کی یاددہانی کرتا تھا ...... "تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں ___!"

وہ پتھروں کی دنیا میں رہتی، جہاں سمجھ بھی مُردہ ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں پتھر لڑتے ہیں، پتھر توڑے جاتے ہیں ...... مگر دل...... دل، گوشت کا لوتھڑا ہے ... کوئی پتھر کا ٹکڑا نہیں۔

میں اُس سے کہتا رہا اور سمجھاتا رہا کہ ماضی کی یاد میں یا مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کہیں اچھا ہے اپنے حال کو تعمیر کرو..... مگر پتھروں سے سر توڑے جاتے ہیں۔ جنوں نے کب سنگ دیکھا۔

فرصت کی بات تھی۔ ورنہ فرصت کہاں......

پتھروں کو ترتیب دیتے ہوئے خود بھی سبیل پتھر بن گیا تھا۔ اور جب بھی فرصت پاتا، تو اپنی باتوں کا آغاز اس جملے سے ضرور کر دیتا۔

"تمہاری بھابھی تمہاری بہت تعریفیں کرتی ہیں......!"

میں صرف ایک رسمی جواب دیتا، الفاظ کی ترتیب نہ بدلی۔

"میری خوش قسمتی ہے......!"

وہ مسکرا کے کہہ دیتا.....

"پتھروں کی دنیا پسند آئی...؟"

میں کھو جاتا تھا، الجھ جاتا تھا، زندگی کی رفتار بھول جاتا تھا۔ میں کہہ جاتا.....

"یہاں سب پتھر ہیں!"

وہ زور کا قہقہہ لگاتا...... قوس قزح اسے قہقہوں کے بادلوں میں چھپ جایا کرتی تھی۔......

قوس قزح پتھر کا مجسمہ تھی، اس کی روح کو آزاد کرنا، اس میں حرارت بھرنا، جوانی کا احساس دلانا، وہاں روح میں جسم کی تپش کی ضرورت تھی....

اُن کے ڈرائنگ روم میں کسی پیر منش کے یہ جملے بار بار میری نظروں کے سامنے آتے تھے۔

"اُن لوگوں کو پاکیزہ نہیں کہا جا سکتا جو اپنے جسم کو دھو کر پاک و صاف کر لیتے ہیں..... حقیقت میں پاک وہ ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہے"

ناھدہ، نیلوفر اور فریدہ کے رنگ پھیکے پڑتے رہے۔ ناہدہ شاعرہ تھی۔ اس لحاظ سے اس کے اور میرے درمیان تعلق قائم ہوا۔ وہ مجھ سے اپنے اشعار کی اصلاح کراتی...... مگر میں اصلاح کی

سرحد کو عبور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حالانکہ قوس قزح اکثر کہتی:

"ایک ادیب کی بیوی کو ایک شاعرہ ہی ہونا چاہیئے......!"

اُس کو کچھ دیر کے لئے خاموش لگا ہوں سے تکتا تھا۔ میں اپنے ردِ عمل پر قابو پاتا تھا۔ جیسے بہت دور کا سفر طے کر کے دم لیتا تھا۔ میں صاف اور واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیتا۔

"یہ قول مجھے پسند نہیں ہے...!"

وہ بھولے پن کو اپنا لیتی، انجان بن جاتی اور یہ کہہ دیتی.....

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں!

میں پھر اُس کو اپنا احساس دلانا چاہتا تھا، اپنی راہ بتانا چاہتا تھا۔

"کبھی کبھی میں بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر کھلے ہاتھ یاد آجاتے ہیں...... دامن چھڑانے کی کوشش میں اُس کے زبان پر سچائی آجاتی.......

"اُن پتھروں میں تمہارا کوئی کام نہیں ہے"۔

کورے کاغذ پر شکن پڑ جاتی۔

پھر ایک ایسی شام بھی آئی، جو سنسان تھی۔ اس شام میں تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کی درخشندہ فضا اور سیاروں کی مسلسل گردش فطرت سے دور اپنے نئے کہانی میں کھو گیا۔

س کہانی نے مجھے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا تھا۔ مگر اس تصوّر کی دنیا میں زیادہ دیر نہ بھٹکتا رہا۔ کسی نے دستک دی ۔۔۔۔ وہ قوسِ قزح تھی!

میں نے دبی دبی آواز میں کہا:

"تم ہو قوس!"

"ہاں میں ہوں!" اُس نے کہا۔

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھی۔ اس کے آنے سے میرے ذہن میں تاریکی بڑھتی گئی۔ جب تک وہ پردہ نہ اٹھاتی روشنی نہ ہوتی ۔۔۔۔ میں نے مجبوراً کہا:

"کیا بات ہے؟"

اُس کے چہرے پر تھکن تھی جیسے وہ لاکھوں میل طے کر کے آئی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر اضطراب کی کوئی جھلک نہ تھی۔ اُس نے پُردرد آواز میں کہا۔

"پتھروں کی دنیا نے مجھے پتھر بنا دیا ہے۔"

میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا۔ ایک جنون کی آگ میرے رگ و پے میں لہراتے ہوئے ذہن پر اثر کر گئی۔ میں نے کہا:

"تمہیں یہ احساس ہوا؟"

وہ خاموش رہی۔ خاموشی بڑی کربناک تھی۔ وہ کھڑی ہوئی ۔۔۔۔ کمرے میں ٹہلتی رہی ۔۔۔۔ دائیں ہاتھ سے وہ اپنی زلفوں کو سنوارتی تھی ۔۔۔۔ کبھی وہ اپنے ماتھے کے پسینے کے قطرے رومال سے خشک کرتی تھی،

......اچانک وہ وحشت زدہ آواز میں کہہ پڑی۔
"چلے جاؤ......پتھروں کی اِس دنیا سے
چلے جاؤ......میں پتھر رہنا چاہتی ہوں......
صرف پتھر رہنا چاہتی ہوں..."
کتنے ہی بُت ٹوٹے، کتنے تصوّرات پاش پاش
ہوئے......میں دوڑا......میں بھاگا......
پتھروں کی دنیا سے واپس ضرور آیا تھا
لیکن میں پتھر نہ بن سکا تھا......
دِل کا درد، رگ بن گیا!!!

آبِ حیات

نواب غیاث الدین بیگ کے پاس دولت کے انبار تو نہ تھے لیکن اب تک ان کے پاس ایک قدیم خاندانی لائبریری تھی جس میں کتابوں کے کچھ نایاب نسخے موجود تھے۔ نواب کسی قدر بوڑھے ہو گئے تھے اور ضعیف بھی۔ ان کا اکثر وقت لائبریری ہی میں گذر جاتا۔ نواب قدیم نایاب نسخوں میں ہمیشہ کچھ پانے کی جستجو میں لگے رہتے۔ نواب صاحب کے دو ہی دوست تھے۔ ایک میر علی جو ادھیڑ عمر کے خاندانی دولت مند تھے اور دولت کو خرچ کرنا بھی جانتے تھے۔ نواب صاحب کا دوسرا دوست ایک نوجوان تھا۔ کتابوں کے مطالعہ کے شوق نے اس کو نواب غیاث الدین کے قریب کر دیا تھا۔

ایک دِن کا واقعہ ہے ، نواب غیاث الدّین بیگ بڑے ہی جوشیلے انداز میں لائبریری کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈگ بھرتے رہے اور یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔ نوکر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ شاید نواب کی مجنونانہ حرکت اپنی مرحوم بیوی کی یاد اس سے پیدا کردہ اضطراب کا نتیجہ ہے۔ لیکن دراصل وہ اپنے دوستوں کا انتظار کر رہے تھے۔ حیاتِ جاوداں (ہمیشہ کی زندگی) پانے کے لئے ایک قدیم نسخہ ان کے ہاتھ آیا تھا۔ جب دوست آئے تو ان کے اِضطراب میں کسی قدر کمی ہوئی۔

وہ تینوں نسخے کے بارے میں بڑی رازداری سے باتیں کرنے لگے۔ تینوں کے دِلوں میں حیاتِ جاوداں کے لئے اُمنگ پورے عروج پر پہنچ گئی۔ اب تک وہ تینوں یہ سمجھتے آئے تھے کہ حیاتِ جاوداں کی اِصطلاح صرف قصّے اور کہانیوں کی خاطر اختراع کی گئی ہے لیکن آج ان کو معلوم ہوا کہ اِس مفروضے کے پیچھے حقیقت بھی موجود ہے۔

ان تینوں کے درمیان طے پایا کہ حیاتِ جاوداں پانے کے لئے وہ مہم اختیار کریں جس کی نشاندہی قدیم نسخے میں کی گئی تھی۔ مہم کا آغاز سمندر کے راستے سے ہونا تھا۔ اِس لئے فوراً ہی ایک سمندری جہاز کا جو جدید سائنسی آلات سے لیس تھا انتظام کیا گیا۔ اِس کے تمام خرچ کو میر علی نے برداشت کیا۔

چونکہ مہم تھی حیات جاوداں پانے کی، اس لئے اس سلسلہ میں راز داری سے کام لینا بہت ضروری تھا۔ لہٰذا کوئی جہازی عملہ ساتھ نہیں لیا گیا۔ اور وہ تینوں نہایت خاموشی سے ساحل چھوڑ کر سمندر کی وسعتوں میں چلے گئے۔

قدیم نسخہ کے مطابق مہم کی پہلی منزل سمندر میں وہ جزیرہ تھا جو ہمیشہ لہروں میں ڈوبا رہتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے تک سمندری پانی کے بدلتے ہوئے رنگوں میں جزیرہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن جزیرہ ان کی نظروں سے چھپا رہا۔ ان کے ارد گرد مایوسی کے جال بچھنے لگے۔ شاید اسی لئے نواب غیاث الدین بیگ نے ایک دن کہا۔

"وہ نسخہ جھوٹا ہوگا، چلو واپس لوٹیں۔"

لیکن شاید اس کے نسخے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے قدرت نے ان کے جہاز کا رخ ادھر کر دیا جہاں لہروں میں ڈوبا ہوا جزیرہ تھا۔ احمد تو چیخ ہی پڑا۔

"جزیرہ مل گیا..... جزیرہ!!"

وہ تینوں ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگے!

ان تینوں نے ایک ساتھ لہروں میں ڈوبے ہوئے جزیرے پر قدم رکھے۔ جزیرے کی سرزمین پتھریلی تھی۔ یوں تو لہروں میں ڈوبے ہوئے جزیرہ پر چھن چھن کر دھوپ کی کرنیں آرہی تھیں۔ دھوپ کی حرارت سے پتھریلی زمین گرم تھی۔ وہ تینوں ننگے پاؤں گرم پتھروں کے راستے طے کرتے رہے۔ مکمل سکوت

میں ڈوبے ہوئے اس جزیرے میں کسی پرندے کی
چہچہاہٹ کی آواز تھی نہ کسی حیوان کا نام و نشان۔ اور
انسان کا تو سوال ہی کیا۔ ان کے پاؤں میں چھالے
پڑ گئے، لیکن وہ چلتے رہے۔ وہ سب مسکراتے ہوئے
ایسے چلتے تھے جیسے پھولوں کے راستے پر ان کا استقبال
حوریں گلپاشی سے کر رہی ہوں۔ منزل کی سختیاں
انجام کی راحت کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہیں!

وہ چلتے رہے اور چلتے رہے۔

قدیم نسخے کے مطابق "حیاتِ جاوداں" پانے
کی دوسری منزل غار کا دہانہ تھا، لیکن اب تک انہیں
کوئی غار نظر نہیں آیا تھا۔ احمد نے ان کو ایک ٹیلے پر
بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے کھانا تقسیم
کیا۔ وہ کھاتے رہے۔ اور مستقبل کے سنہرے
جھولے میں جھولتے رہے۔

کھانے کے بعد..... سفر پھر شروع ہوا —
سورج ڈوب گیا۔ اندھیرے نے جزیرے کو اپنے دامن
میں چھپا لیا۔ اب ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے
لیکن "حیات جاوداں" پانے کی کوشش ہر مشکل پر قابو
پاتی رہی۔ پھر وہ انتہائی خاموشی سے ایک ٹیلے پر
بیٹھ گئے۔ اپنے سفر کی دوسری منزل پانے کی ناکامی کا
رونا روتے رہے۔ کسی نے ان کے کانوں میں کہا:
"رک جاؤ، سامنے وہ سرخ پتھر ہے اس
کو ہٹا دو۔"

وہ تینوں ایک ساتھ دوڑ پڑے اور اپنی تمام طاقت جمع کر کے سُرخ پتھّر کو ہٹانے لگے۔ اُن کے بازو فولادی بن گئے۔ جانے اُن کے بازوؤں میں قوّت کہاں سے آ گئی تھی۔

احمد سب سے پہلے غار میں داخل ہوا۔ غار میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ غار کی چھت سے پانی کے قطرے ایسے گرتے تھے جیسے آسمان سے ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو۔ وہ تینوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مہم کی دوسری منزل پر چلتے رہے آگے بڑھتے رہے۔ سفر کے دوسرے حصّے میں وہ ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے بدن سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اور وہ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہوں۔ ہیبت اور سکوت بھرے اس ماحول میں "حیاتِ جاوداں" کا خیال اب بھی ایک دل فریب حسینہ کی طرح ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

نہ جانے کتنے دنوں تک وہ چلتے رہے۔ وقت کا حساب اور احساس کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی شدّت اختیار کر لیتا کہ کیوں نہ واپس لوٹ چلیں۔ لیکن واپس لوٹنا بھی اب آسان نہ تھا!

اچانک غار میں بجلی چمکی۔ لمحے بھر کی یہ روشنی بھی جیسے سوال بن گئی۔ آخر تم لوگوں کو "حیاتِ جاوداں" کیوں چاہیئے، نواب غیاث الدّین بیگ سوچتا رہا۔ اُس کے پاس رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تو نہیں لیکن وہ

بھیک منگا بھی نہیں ہے۔ اب بھی مُشتری بائی کے لطیف گالوں سے محظوظ ہوتا ہے اور اس کی شوخیوں میں راتیں بتائی جاتی رہی ہیں۔ پھر ایسی عیش پسند زندگی سے فرار کیوں؟ اور ایسے غار میں "حیات جاوداں" کی تلاش میں مارا مارا پھرنا کیوں؟"

"زندگی کے حسین پہلوؤں کو اور بھی حسین بنایا جا سکتا ہے۔ جب کہ زندگی امر ہو۔"

اس خیال نے انہیں پھر مطمئن کر دیا۔

میر علی کے پاس بے حساب دولت تھی۔ اور دولت سے زندگی کی کون سی چیز وہ خرید نہیں سکتا تھا لیکن "حیات جاوداں" کا کوئی مول نہیں۔ اگر یہ پانے کا موقع اُسے ملے تو کتراتا کیوں؟

احمد جوان تھا۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے ناواقف، لیکن مہم پسند نوجوان تھا۔ اس نے سوچا اگر "حیات جاوداں" ملی تو اچھا، نہیں ملی تو کیا ہوا، ایک مہم سے تو لطف اندوز ہوں گے۔

بجلی کی چمک نے ان کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ اچانک میر علی نے بلند آواز میں کہا:

"مل گیا، مل گیا، دروازہ مِل گیا!"

وہ تینوں خوشی کے مارے ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ رقص کرنے لگے۔ مسرت سے بھرے رقص اور بے ہنگم آوازوں نے غار کے سکوت کو درہم برہم کر دیا

وہ ناچتے ناچتے بے سُدھ ہو کر دروازے کے پاس گر گئے۔ سونے کا دروازہ خود بخود کھُل گیا۔ خوشبو میں ڈوبی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا اُن کے نتھنوں میں گھُس کر ان کے جسموں کو سیراب کرنے لگا۔ تینوں میں قوّت واپس آ گئی وہ کھڑے ہو گئے۔ اور دروازے کے اندر داخل ہو گئے۔

سفر کا تیسرا حصّہ بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز ثابت ہوا۔ وہاں وہ سب کچھ موجود تھا۔ جس کا ذکر قدیم نسخے میں کیا گیا تھا۔ سرسبز باغ بہت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان تینوں کی نظریں باغ کے آخری حدود پانے میں ناکام ہوئیں۔ وہاں آبشار تھے۔ خوش رنگ پرندے تھے۔ جن کی چہچہاہٹ ایک لطیف کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ سارا ماحول ایک رومانی تاثر پیدا کر رہا تھا۔ حوروں کی قطاریں ان تینوں کے اِرد گرد کھڑی ہو گئیں۔ اُن پر رنگ برنگ پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی پا رہے تھے۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ ان کے کانوں کے پاس نہایت ہی شیریں اور دھیمی آواز میں کوئی کہہ رہا ہے:

"خوش آمدید..... خوش آمدید"

"آبِ حیات" تلاش کرنے والوں کو خوش آمدید!!!"

وہ تینوں حوروں کی قطار میں توڑتے ہوئے اُس جانب دوڑنے لگے جہاں زمرّد کے تالاب میں "آبِ حیات" ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ تینوں آبِ حیات کے تالاب سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو اپنا سر بلند کر کے چلے گئے۔ اب اُن کے پاس حیاتِ جاوداں تھی۔ ہمیشہ کے لئے وہ... لافانی انسان بن گئے تھے۔

وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ موت اب ان کے لئے ایک خواب ہے۔ جس طرح کل ان کے لئے حیاتِ جاوداں پانا ایک خواب تھا۔ وہ اب کامیاب و کامران اپنی دنیا میں واپس لوٹ رہے ہیں!!

ایک سفید پرندہ اُڑتا ہوا آیا کچھ اخبار اُن تینوں کے سامنے پھینک گیا۔ ان تینوں نے اخباروں کو اُٹھا لیا۔ اخباروں کے سرورق پر مغل سرائے کے نزدیک ایک بھیانک ٹرین ایکسیڈنٹ کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ اور مرنے والوں کی فہرست میں اُن تینوں کے نام بھی تھے۔ خبر پڑھ کر وہ تینوں حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے!!



مٹھی اڑان آسمان

مجھے یہ معلوم نہیں۔ کہ مجھ پر یہ حقیقت کب آشکارا ہو گئی۔ کہ میری شبیہ آئینے میں نظر نہیں آرہی ہے۔ ایسے اوقات زندگی کا حوصلہ توڑنے والے تو ضرور ہونے چاہئیں، لیکن ہماری گرفت کب اور کہاں تک رہ سکتی ہے ہم پر؟..........

میں پھیلتے پھیلتے اتنا پھیل گیا کہ شناخت نے اپنے معنی بدل ڈالے۔ میں شہر کی سب سے اونچی عمارت کے سب سے اونچے طبقے کے اندر چھپا نکلنے لگا۔ میرا بچہ مجھے دیکھ کر اپنی ماں سے چیخ چیخ کر کہنے لگا......

"ممی...... ممی...... ڈیڈی بھوت بن گئے۔"

یہ پہچان پر پہلی کاری ضرب تھی۔ لیکن یہ احساس

بہر حال اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت اختیار کرنے لگا کہ میں اپنے تصور سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔ قد کے اونچے ہونے پر سنبھل سنبھل کر چلنے کی بصارت مجھ سے چھین لی گئی .... کب اور کیسے فہم کی لوہے جیسی دیوار ٹوٹ گئی اس کے بارے میں ایک ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ہوا۔ میرے پاؤں کے نیچے آئی ہوئی بھکارن پہنچی تو ضرور ہو گی۔ لیکن اتنے اونچے قد پر سماعت کیسے ہو گی۔ یہ تو دوسری بات ہے۔ کہ جب بھونچال آتا ہے تو کتنی ہی قد آور چوٹیاں اپنا سر خم کر دیتی ہیں۔ وہ بھی ایک بھونچال تھا۔ جس نے میری چھین لی گئی سماعت مجھے واپس کی۔

"کمینے! ... پاجی!! ..... ذلیل!!!"

وہ میرے بھاگتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے قدم ملاتی رہی۔ بھکارن کا نحیف مریل جسم جنون کا مرکزی کردار بنا۔ یہ کہاں کی بہادری تھی۔ کہ اژدہام کے سامنے میں سینہ تان کر کھڑا ہوتا ــــــ تاریخ نے ایسے کرداروں کے ساتھ کیسا سلوک کیا، کیا وہ ڈھکی چھپی بات ہے ــــ؟

کتنے ہی کٹے ہوئے جسموں کو سونے کے تمغے عطا کئے گئے۔ لیکن وہ تو حالات نے لافانی بنائے یا شوق نے۔ اس لئے میں نے ایک وسیع سرسبز میدان میں اپنے لئے ایک پناہ گاہ بنائی۔ لیکن میدان میں دروازہ کیسا....؟

پھر بھی میں نے دروازہ بند کیا۔ اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا۔ جلاد کی تیغ جب چلتی ہے تو کس کو معلوم ہے کہ کہاں جا کر لگے گی۔ میدان تو میدان ہے۔ کب تک میں محفوظ رہ سکتا۔ وہ سوچتے رہے اور میں اپنے آپ کو بچاتا رہا۔ پھر جب وہ تھک گئے اور میری معصومیت پر مٹنے کے لئے راضی ہو گئے تو میں سمجھا کہ میرا سب کچھ ڈھل گیا

میں اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا۔ جیسے شیر کچھار سے۔ لیکن معصومیت میں جادوگری کی روح حلول ہو گئی۔ شعبدہ بازی اب تو میرے لئے گھر کی لونڈی بن کر رہ گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ میری ہر حرکت کو کسی کی تباہی یا فلاح پر تعبیر کرنے لگی۔ اور اب جب میں مہاتما سمجھا گیا تو ہمارے لئے خانقاہوں کی بنیادیں ڈالی جانے لگیں۔

کچھ بھرم تو رکھنا ہی ہوگا۔ اس لئے مریدوں کو کب تک مایوس کرنے والا تھا۔ میرا قد جو پہلے ہی اونچا تھا اور اونچا ہوتا گیا۔ یہ اب میرے لئے ضروری بن گیا تھا کہ میں اپنے پرستاروں کو اپنے زریں اقوال سے آشنا کروں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بہت سے اقوال بہت ہی پرانے تھے، لیکن ہر پرانی چیز کا نشہ دوآتشہ ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کہا:

"آپ اپنے آپ کو پرکھنا چاہتے ہو تو اپنے ہی جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرو۔ بیٹھے بٹھائے

میں بہروپ سے نجات کون چاہتا ہے۔

نقصان پر فائدہ ہمیشہ بھاری لگتا ہے۔ پھر نہ جانے کہاں سے انا آ ئی۔ پہلے مجھے گلے لگایا۔ میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ پھر جاتے جاتے ناگ اپنے گلے سے اتار کے میری گردن میں پہنا دیا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اس سے کہوں، کیوں بھئی؟ اس بوجھ سے میری گردن تھک جائے گی۔۔۔

لیکن میری زبان نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ اس ناگ نے مجھے اپنی گرفت میں اس سختی سے لے لیا جیسے کسی نے مجھے ارغوانی شراب میں نہلا دیا ہو۔ بے ہوشی کی اس کیفیت سے فرار کا صرف ایک ساعت رہا تھا کہ ناگ سے چھٹکارا حاصل کروں۔ لیکن ناگ مجھ سے زیادہ ہوشیار تھا۔ میں راستوں کا انتخاب کرتا رہا اور وہ اپنے اوپر میرا خون ملتا رہا۔

پھر نہ جانے مجھ میں جہد کا جذبہ کیسے اور کیوں کر آندھی کی تیزی اختیار کر گیا کہ میں نے ناگ سے اپنی گردن آزاد کرانے کے لئے اپنے فولادی ہاتھوں میں اُس کا جسم لیا۔ لیکن اس نے اپنے جسم کی مضبوطی سے کام لیتے ہوئے میری گردن دبوچنی شروع کی۔ مجھے اپنا سانس رُکتے ہوئے محسوس ہونے لگا۔ میرے ہاتھوں سے طاقت چھین لی گئی۔ میں ہار گیا۔ لیکن کیا وہ میرا ہاتھ کھل گیا۔۔۔ یا۔۔۔

میری مٹھی کھل گئی۔۔۔ اب تو اڑان تھی،

اڑان کی کوئی سرحد نہیں ہوتی ہے۔ خلا میں اُڑنے والے
آسمان کو اپنی سمت بناتے ہیں۔ آج مجھے معلوم ہوا
کہ آئینہ سبھی جھوٹا ہے۔ آئینہ کب کسی کو پہچان پایا
کہ اب مجھے پہچان پاتا۔
ابھی وحدت کا لفظ ملا .... ورنہ آئینہ
کب کا ٹوٹ گیا ہوتا۔



آتش بیاں

جب ھم سوچتے رہتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو کیا ھوگا......؟

کیا!

سالہا سال سے "یہ کیا" ہمارے ذہنوں میں ہیبت کے بوجھ تلے دبا رہا۔

اور پھر اُس "کیا" کا سفر اُس شام شروع ہوا جب ہمارے اس چھوٹے سے شہر کو کالی آندھی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ساتھ ناگوں کے بدنوں پر لوگوں کا جمِ غفیر اُبھر آیا۔

اُس بڑے میدان میں جہاں آوازوں کا شور اب بھی سنائی دیتا ہے وہ شعلہ بیان کہتا ہے:

"جب اندیشے باہر سے ہوں تو ذہن پریشانیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ جب خوف باہر سے ہو تو ڈر دل میں پیدا ہوتا ہے۔ خوف اور اندیشے ہماری صدیوں کی غلامی کی دین ہیں۔ جب تک ہم خود اعتمادی سے اپنے آپ کو دور رکھیں گے تب تک یہ خوف اور اندیشے ہم پر حاوی ہوتے رہیں گے۔

کیا وہ آتش بیاں اب تھک گیا۔ لیکن ہم اس رات سو نہ سکے۔ اور پھر "کیا" کا آخری سفر شروع ہوا۔ ہم شانہ بشانہ کندھا ملاتے ہوئے نظم و نسق کے ساتھ چلتے رہے۔ جب کرنیں ڈل کے شفاف پانی میں اتر گئیں تو موذن کی آواز سنائی دی۔

"اَللّٰہُ اَکْبَر"......

ہم نے آخری مشتِ خاک بھی اُن پر وار کی۔ اب سوچوں کا جھیل بار بار ہم سے یہ سوال کرتا رہا۔

"اب وہ آتش بیاں کہاں ہے؟"

ہم اندھیرے میں ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے رہے اور کہتے رہتے......

"وہ درویش صفت لوٹ آئے گا——!"

لیکن سوچوں نے پھر ہمیں "کیا" کے حوالے کر دیا......!

طِلسمِ کلامُ

وہ شہر جہاں سیمنٹ اور لوہے کے بنے ہوئے قفس آسمان کو چھو رہے ہیں!

وہ شہر جہاں چمنیوں سے نکلا ہوا کالا دھواں سینوں میں دفن ہو جاتا ہے۔!!

وہ شہر جہاں رات دن کے آغوش میں دَم توڑتی ہے.....!!!

اُس شہر میں موت زندگی سے بھاگ کر سمندر کی تہوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اُس اجنبی شہر میں ہم سوداگر بن کر وارد ہوئے۔ بہت دنوں تک ہم اُس شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے رہے۔ پھر ہم اس شہر سے ہجرت کے لئے بستر باندھے کھڑے تھے کہ خضر ملا۔ وہ کہہ پڑے

"کہانیوں کے سوداگر! ھمارے اِس شہر میں.....!"

"سوداگر ہوں ، حضور سوداگر!!"

"کیا نام رکھا ہے اپنی کہانی کا.....!"

"طلسم ھوشربا!"

"خوب! نام تمہارا، کام ھمارا!"

"لیکن.....!" ھم بطورِ احتجاج بول پڑے۔

"فاقے..... سوداگر..... فاقے....."

ھم خاموش ھو رہے۔

طلسم ھوشربا کے پہلے صفحے پر مختلف اقسام کی ضیافتیں اندراج تھیں۔

اور دوسرے صفحہ پر سمندر کے کنارے خوبصورت بنگلہ، گیٹ کے سامنے ایک بڑی گاڑی.......اور نہ جانے کیا.....کیا!!!

تیسرے صفحہ پر مہ جبیں اپنے دستِ نازک میں بلوری آہنگ میں جام لئے کھڑی تھی۔

ھم تو صرف طلسم ہوشربا کے ان اوراق کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک ولے خضر نے ہمیں پکارا.....

"طلسم!" ہماری نئی ہیروئن کا نام کیا ھوگا؟

"لیکن میں تو صرف..... کہانی.....!"

"معاوضہ معقول ھوگا.....!"

طِلسم ھوشربا نے کہا:
"کلام......"

"خوب..... بہت خوب!!" خضر خوشی سے اُچھل پڑے.....

پھر ھم کلام سے ملے......

وہ کلام جو ہمارے دل کے اُس خانے میں رہتی تھی جس کا دروازہ ہم نے بند کیا تھا۔ وہ میرے اُس شہر کی تھی جہاں ہم نے ہر درگاہ پر اپنا سر ٹیکا دیا تھا۔

تب وہ نہ کلام تھی اور نہ میں طلسم ہوشربا تھا! میں صرف کالج کے چپراسی کا ایک لڑکا تھا!
اور......وہ کالج کے لیکچرار کی بیٹی تھی......!

بہت دِنوں ہم لیکچرار اور چپراسی کی کشمکش میں ڈوبتے رہے اور اُبھرتے رہے، پھر چپراسی کے رزق پر جب خطرہ لاحق ہوا، ہم نے اُس شہر کو الوداع کہا۔
اَب یہ لیکچرار کی بیٹی اس سنگ زار شہر میں کیوں؟

ہم بہت دنوں تک ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ رہے، نہ میں اپنے وعدے پر اٹل رہا، نہ وہ لیکچرار کے حکم کی تابع رہی۔

یہ سب دیکھ کر لیکچرار آپے میں نہ رہے۔ لیکن سورج سمندر میں اُتر چکا تھا۔ وہ رشتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے شہر واپس چلا گیا۔ یہی کیفیت کچھ خضر کی بھی تھی جب .... کر اپنی کہانی کے لئے

نا موزوں قرار دیا۔ اور مجھے بھی اپنے عتاب کا شکار

بنایا

لیکن کلام مجھ میں اور میں کلام میں اپنے آپ کو

تلاش کرتے رہے۔ تنہائی ... البتہ یہ خوشی دیر پا ثابت

نہ ہوئی۔

طلسم ہوشربا کے دوسرے صفحے کے ساتھ ساتھ

اب پہلا صفحہ بھی بند ہو گیا۔ اس ناگہانی آفت سے فرار

مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں نے لاکھ جتن کیے کہ طلسم ہوشربا

کے اوراق پھر سے کھل جائیں لیکن ناکامی نے

ساتھ نہ چھوڑا۔

اور ایک بار پھر خضر کے دروازے پر جا

کھڑا ہوا۔

خضر نے مسکراتے ہوئے کہا:

"طلسم! تم میرے عزیز ہو۔ کلام کو ہیروئن

بنا کر جو خطرہ ہم لے رہے ہیں وہ معاوضہ طلب

ہے۔"

کلام اور میں دونوں بہت رات تک جاگتے رہے

...... پھر میری آنکھ کب لگ گئی ......

کہ طلسم ہوشربا کے سارے کے سارے

اوراق میرے سامنے بکھرے پڑے تھے ...... لیکن

طلسم کی کلام ٹوٹ گئی تھی۔

پہچان

وہ اپنی اَنا کے سامنے اپنے مزاج کی خود سری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ کشمکش اُس کی ذات کے لئے بڑی تلخ اور تکلیف دہ تھی۔ اب وقت کے ساتھ یہ احساس بھی حاوی ہونے لگا کہ اپنے سرمایۂ حیات کا سب سے حسین بُت خود مسمار کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اُس لمحے اس نے اپنے دِل کو نیزہ کی نوک پر محسوس کیا۔

وہ ٹوٹتا رہا۔

آہستہ آہستہ خود سپردگی کا عنصر اُس پر قابو پانے لگا۔

وہ جب اپنے بُت کو چھُونے لگا تو بُت نے کہا:

"تم کون ــــ؟"

"میں یوسف ــــ!"

اُس نے بہت آہستہ سے بت کے کان میں کہا۔

"تم یوسف نہیں ہو......!"

اور یوسف بے بسی سے رات کی سیاہی میں اپنے وجود کی پہچان کو گمنامی کے اندھیروں میں کھوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

خودسری

وُہ رات لمبی اور اذیت ناک تھی ۔ کُہرے
جھُرمٹ میں زندگی کی ساعتوں کو جب اُس نے دم
توڑتے ہوئے دیکھا تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔ کہیں
کسی حسین شاہکار کی تکمیل کے لئے بھیانک اندیشے
بھی زندگی کے ساجھے دار بنتے ہیں۔ وہ دیر تک اپنے
دِل کو آنے والی دلفریب آشاؤں سے بہلاتا رہا۔
پھر اچانک کسی نے اُسے خوابِ شیریں سے جگایا۔ وُہ
سفید گون پہنے ہوئے قدآور شخص اپنی آہنی آواز
میں کہنے لگا۔
"کیا یہ ضروری ہے کہ تمہاری خودسری تمہارے

لئے فائدہ مند ثابت ہو۔

لیکن......

قد آور شخص نے آگے کہا:

"شاہکار کا بننا تو دور کی بات ہے اب تو معمار بھی لوٹ گیا۔"

وہ اندیشے جواب تک حقیقت سے بعید تھے اس نے اپنی خودسری سے ان میں جان ڈال دی۔

گمراہی

جب اُس نے اَپنے پاؤں ریشمی دبیز قالینوں پر رکھے تو یوں محسوس ہوا کہ جنّت کا پہلا نشان ملا۔

وہ سنگِ مرمر کے عالیشان محل میں اپنے ماضی اور حال کی اَن گنت الجھنوں کو یاد کرنے لگا۔ جن سے وہ فرار حاصل کرنے کے لئے جتن کر رہا تھا۔

اطلس اور کم خواب کے سجے ہوئے فرنیچر، بلّور کے فانوس، چاندی کے برتن .... جب یہ سب اس کی نظروں میں آ گئے تو اُسے اپنے مستقبل کے ہولناک اندھیرے اور بھی گہرے ہوتے ہوئے

ہر آنے لگے۔ شہنشاہی کرسی پر براجمان اپنے درعدن
کے نکلس سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا:
یہ سب حاصل کرنے کے لئے سنگ و دو کرنے کی
ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اپنی ..... آنکھوں
کو خود ہی بینائی سے محروم کرنا ہوگا۔
لیکن ..... وہ بے بس آواز میں بول پڑا۔
"سوچ ترقی کے لئے مضر ہے"
وہ شخص کھڑا ہوا۔ اور اپنی آہنی سیف
میں اس کی بینائی کو محفوظ رکھا۔ اب وہ اندھا
آدمی اپنی گمراہی پر آنسو بھی نہیں بہا سکتا۔

سکوت در سکوت

جس سفر کا اختتام ہوا ہو، اُس کا تذکرہ کرنا بے سود ہے۔ لیکن بشر غلط فہمی کی زنجیر اپنے گلے سے لپٹائے رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دانش کے دریچے اُس پر وا کر دیئے گئے ہیں۔ پھر یہ منطق بھی تراش لیتا ہے کہ سفر کے اختتام کے بعد نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

وہ ایران سے بھاگا ہوا رستم زماں ہے جس نے ہمارے یہاں پناہ لی تھی۔ جب ہم چھوٹے تھے، تو اُس کے کندھوں پر چڑھ کر ساری دنیا گھوم آنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ اور وہ تھکنے کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ رستم زماں تھا۔ ہم قہقہے اُڑایا کرتے تھے اور وہ بُرا مان جاتا تھا لیکن

لیکن یہ ہمارے ساتھ بہت دیر تک نہ رہا۔ کیونکہ ہم بچے نہ رہے۔ اب ہمیں بھی یاد آگیا کہ خلیل جبران

نے کہا تھا کہ زمین پر سونے والے بھی وہ خواب چرا لیتے ہیں جو اطلاس اور کمخواب پر سونے والے اپنا حق سمجھتے ہیں...... شاید یہ میرا اپنا جملہ ہے یا شاید خلیل جبران سے ادھار لیا...... اور کچھ اپنا جوڑ لیا۔

ڈھلتی ہوئی عمر میں آدمی کا اپنا سایہ بھی گھٹتا جاتا ہے۔ سایہ جس کے دراز ہونے پر وہی آدمی گمان کرتے رسّہ کشی کے جال میں اُلجھ جاتا ہے۔

اَب آئیے! ذرا اپنے سندباد جہازی کا افسانہ شروع کریں۔ ہوا یوں کہ پہلے جو سوال اُس کی نگاہوں کے سامنے اُبھرا۔ اُس سے وہ چکرا کے رہ گیا۔ وہ گاؤں کا تھا۔ جس کی محبت، معصومیت اور انسانیت کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول کی طرح بے داغ تھی۔

سوال؟

ڈر، خوف، ہیبت......

لیکن اب اسے کون سمجھاتا کہ اس سوال کا جواب یوں تھا۔

سبز...... زرد......، سُرخ

ہر چوراہے پر نہ جانے وہ کتنی بار ان رنگوں سے گذرا۔ اور اُبھرا، ہچکی بھی کوئی چھپانے کی چیز ہے۔؟ اور پھر ہچکیاں خامی شہرت کا بہانہ بن جاتی ہیں۔

"میں تمہارا گھوڑا ہوں۔۔۔ تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ......!

وہ میرے چار سال کے بچّے سے کہتا اور میرا بچّہ واپسی میں کہتا:

"چل میرے گھوڑے، دوڑ میرے گھوڑے، کیا تھک گئے تم میرے گھوڑے... دوڑتے رہو، دوڑتے رہو۔"

چھ گھنٹے پہلے وہ ایکس رے مشین کے سامنے خود ہی کھڑا ہوا تھا۔ میں پہلے ایکس رے کو ہاتھ میں لے کر سڑکوں، گاڑیوں، حیوانوں، انسانوں اور اپنے آپ کے بیچ گذرتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس ہانپتے ہوئے پہنچا۔ تو گیلا ایکس رے فوٹو میرے ہاتھ سے گر کر ڈاکٹر کے قدموں پر جا پڑا۔

حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ، حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ
حَیَّ عَلَی الفَلاح، حَیَّ عَلَی الفَلاح

"نماز پڑھنے آؤ، نماز پڑھنے آؤ
نجات پانے آؤ، نجات پانے آؤ"

کل جو کتاب میں نے شروع کی تھی، وہ آج ختم نہ کر پاؤں گا۔ اس میں اکثر بیشتر جملے مصنّف نے بڑے جذباتی انداز میں لکھے ہیں۔ جذبات کا آج کی سائنسی اور تکنیکی دنیا میں کیا کام ہے..... لیکن میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے ہیں۔ وہ جب ذبح خانے کے دروازے پر کھڑا ہوا تو.......

"مجھے کہا تھا.... فکر کا ہے کی، میں ہوں رستم"

اَللّٰہ، اَللّٰہ، اَللّٰہ
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

جانے کتنی بار وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اُترا
جھانکا اور جھانک کر چلا گیا۔
کل علی الصبح کالج جانا ہوگا۔ جو لڑکے اس بار بھی
ٹیسٹ میں فیل ہوئے ہیں، اُن سے یہ کہنا ہوگا کہ وہ اگلی
بار ٹیسٹ میں فیل نہ ہوں۔ ورنہ وہ دوسری جماعت میں
جا نہیں پائیں گے۔
میں پکارتا رہا........ چیختا رہا........
چلّاتا رہا.........!
ڈاکٹر!........ اگلی بار....... اگلی بار.......
نقارخانے میں طوطی کی آواز کی اہمیت ہی کیا۔
وہ ٹیکسی کی سیٹ پر پھیل کر رہ گیا........ ٹانگیں
کھڑکی سے باہر آگئیں اور ٹیکسی بھاگی جا رہی تھی........
سڑکوں کی خاموشی.... اداسی سب کو سمیٹ کر اپنے ساتھ
لے جا رہی تھی.... تن پر کپڑا، زمین کی مٹی اور........
اَللّٰہ اکبر
اُجالے کی کرنیں پہاڑوں سے چھَن چھَن کر آ رہی تھیں
قوس قزح میری مٹھی میں بند ہو کے رہ گئی۔ پھر
آنسو کیوں ہے؟
میرا ہم شکل پیٹرول پمپ کے پاس میری گاڑی کی کھڑکی
کے پاس کھڑا ہو گیا........
پگلے........ تم سے ملنے بھی بہت جلد آ رہا ہوں۔

نیا حکمراں

آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی جستجوئے تلاش کے دوران ہتھوڑے کی زد پر ایک قدیم مسودہ ابھر آیا۔ اس مسودے میں داستان گویوں پر رقم طراز ہے۔

ہمارے شہر میں صدیوں سے یہ رسم چلی آ رہی تھی کہ جب کبھی کوئی اپنی زندگی سے ناطہ توڑ دیتا تو یہ مانا جاتا کہ اس آدمی نے اپنی زندگی میں کبھی نیک نامی کے ساتھ صحبت نہ رکھی، اس لئے اس کے جسدِ خاکی کو شہر سے دُور ایک چوراہے پر گدھوں کی شکم پروری کے لئے رکھا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اپنے جسدِ خاکی سے گدھوں کی بھوک مٹا کے نیک نامی کا دامن تھام سکے۔ لیکن اکثر راہ گیر تعفن سے بچنے کے لئے ناک اور آنکھوں پر رومال رکھ لیتے، شاید وہ اپنے انجام سے شرمندہ ہوتے تھے۔

یا اپنے انجام پر ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ گِدھ اپنی بھوک مٹا کے آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتے تھے، مُسوّدے میں شاید یہ واقعہ جگہ نہ پا سکا۔ حالانکہ وہ بوڑھا جو اپنی عمر سے بھی زیادہ وقت زندہ رہا ہے۔ اپنی جوانی میں خوب رُو رہا ہوگا۔ قد و قامت کا بھی اونچا ہوگا۔ انداز گفتگو میں شیرینی بھی تھی ...... لیکن اب گِدھوں نے اس کا گوشت کھا کھا کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ چھوڑا تھا۔ گِدھ اس کے ہڈیوں کے ڈھانچے کو چبا نہ سکے۔
حالانکہ ایسا ہوتا آیا ہے۔ اس کے برعکس وہ چپ چاپ جنگل کی گہرائیوں میں کھو گئے۔ پھر آناً فاناً ہڈیوں کے ڈھانچے میں روح داخل ہو گئی۔ اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہر کی جانب روانہ ہوا... وہ چیخا اور چلایا...... میں آ رہا ہوں — شہر آج بھی حسبِ معمول مصیبتوں میں گھِرا ہوا تھا۔ زندوں کی بستی میں ایک مُردہ لاش کی باتوں کو بھلا کون سننے والا تھا۔ زندگی کی خوبصورتیوں میں بدشگونی کے لئے کہاں جگہ ہے؟ ایسے لمحوں میں یہ کہنا کہ دوراندیشی کو اپنا ہی پاسباں سمجھو پاگل پن کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے انسان ایک خوبصورت جال میں رہا ہے۔
وہ مُردہ لاش جب شہر کے چوک پر پہنچی تو سارے شہر کے باشندے اپنی میتوں کا حساب دیے بغیر سو گئے۔

داستان گو آگے لکھتا ہے کہ اس کے بعد اس کے شہر میں سورج نہیں نکلا۔ شہر کے باشندے غفلت کی نیند سوتے رہے اور یہ محسوس بھی نہ کر سکے کہ اس رات کی صبح نہ ہو گی۔

ان سب کی سوچ مفلوج ہو کے رہ گئی تھی۔ اس لئے وہ مُردہ لاش اپنے ہاتھ میں چابک لئے گلیوں اور کوچوں میں گھوم رہی تھی اور سب اس کے احترام میں سر جھکاتے رہے۔ لیکن اچانک دبی اور دبائی گئی بستی میں بغاوت کا پرچم اونچا ہو گیا۔ لیکن بغاوت انقلاب کی نوعیت اختیار نہ کر سکی............

...اور باغیوں کا سر قلم کر دیا گیا۔

باغیوں کے اس حیران کن اور عبرت خیز انجام پر مُردہ لاش خوشی میں اچھلنے اور کودنے لگی اور اس نے ڈھول پیٹ کر یہ اعلان کیا۔

جو لوگ مجھے مُردہ اور بے جان سمجھتے ہیں دراصل وہ خود مُردہ ہیں اور اپنے احساسِ کمتری سے فرار حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔

اس دن شہر کے تمام باشندے اپنی حقیقت پر غور کرنے لگے ـــ وہ اپنا تجزیہ کرنے لگے۔ لیکن محفل کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ہی برخاست کر دی گئی۔ آخری مجلس میں یہ بات طویل بحث و مباحثہ کے بعد طے پائی کہ وہ سب کے سب مُردہ تھے۔

صدیاں گذرنے کے بعد ایک نوجوان نے اُن

سے کہا۔

"یہ حقیقت اپنی جگہ مُسلّمہ ھے کہ زندہ زندہ ہے

اور مُردہ مُردہ ھے.... دل کی روشنی روشنی

ہوتی ہے اور کالی رات..... کالی رات ہوتی

ھے...." زندہ لاش کے اس شہر میں ایک نوجوان

کو خبطی کہا گیا... گالیوں سے نواز اگیا.... جوتوں

کی بارش کی گئی.... پتھروں سے خوش آمدید

کیا گیا۔ جس مکان میں اس نے پناہ لی اس کو جلایا

گیا.... جس راستہ پر وہ چلا.... اُس راستے کو کاٹ

کر پھینکا گیا۔ لیکن زندہ دل نوجوان کے لئے یہی

باتیں مقبولیت کا ہتھیار بن گئیں ــــــ وہ

اپنے مقصد پر ڈٹا رہا۔ بالآخر اس نوجوان کو صلیب

پر لٹکایا گیا.... گدھ اس کا انتظار ہی کر رہے

تھے.... لیکن اس بار وہ لاش کا گوشت نہ کھا سکے۔

پھر وہ لاش اپنی قوت سے کھڑی ہو گئی

...... انقلاب کی تختی اپنے گلے میں آویزاں کی،

جو بھی آتا گیا اس کو روندتا چلا گیا۔ ہڈیوں

کے ڈھانچے کو ہوا میں اچھالا اور زمین پر

پٹاخ سے پھینک دیا۔

پھر وہ ہیرو بنا۔ اپنے اقوال کو سنہرے

فریم میں ہر موڑ پر آویزاں کرتا رہا۔ وہ شہر

کا نیا حکمراں تھا....

شہر ایک بار پھر کالی رات میں سفر
کرنے لگا۔ یہ کہتے کہتے داستان گو بھی
سو گیا۔۔۔

●

منفی کا قاعدہ

اُس شہر کا چوک .....!
کبھی سبز! کبھی زرد! اَب سرخ کہلاتا ہے۔
اب اُس چوک میں ایک کلاک ٹاور بھی
نصب کیا گیا ہے۔ جب سے چوک میں کلاک ٹاور
نصب کیا گیا تھا، اُس دِن سے تنوّمند نوجوان
ٹاور کے سامنے کھڑا ہو کر......
"بڑھنے کے لئے راستے کے بڑے پتھروں
کو ہٹانا ہوگا۔۔۔ پتھروں کو ہٹانے
کے لئے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش
کرو۔ تم لوگوں کے دِل قربانی کے جذبے
سے تب معمور ہو سکتے ہیں جب آنکھیں
رکھتے ہوئے بھی اندھے بن جاؤ گے

آؤ میرے دوستو! ہم اندھوں کی طرح ایک ایسی منزل کی جانب روانہ ہوں جس کی نشاندہی کوئی بھی نہیں کر سکا۔"

اس شہر کے ارد گرد جو پہاڑوں کا سلسلہ ہائے دراز تھا وہ برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ لیکن جب کبھی ان پہاڑوں میں ہریالی ہوتی ہے۔ وہاں کی ایک بلند چوٹی پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص کھڑا ہو کر بلند آواز میں کہتا ہے۔

"میرے ہم وطنو! میرے دوستو!

یہ جو میرا جوتا ہے، یہ جو میرا پتلون ہے، یہ جو میری قمیص ہے، یہ جو میری ٹائی ہے، یہ جو میرا کوٹ ہے...... یہ میرے آسودہ حال ہونے کی کہانی نہیں ہے بلکہ میرے ذہن سے اترے ہوئے زنگ کی علامت ہے...... میرے عزیزو! اگر تمہیں اپنی مفلسی سے اپنی بے بسی سے نجات چاہیئے تو پھر اپنے ذہنوں پر چڑھے ہوئے زنگ کو اتار لو...... میرے مشاہدے سے فیض حاصل کر لو...... منزل حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ میں جذبۂ قربانی پیدا کرو......"

پہاڑوں کے دامن میں وادی بھی تھی اور اس وادی میں ایک شاہی محل بھی تھا۔ شاہی محل کے آرام گاہ میں شہنشاہ خوابِ شیریں کے عالم میں تھے۔ شہنشاہ کے آرام گاہ کے دروازے پر وزیرِ اعظم خصوصی باریابی کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ شہنشاہ جب خوابِ شیریں سے لوٹ آئے تو انہوں نے اپنی حسین کنیزوں سے کہا:

"آج میری طبیعت کیوں پُر ملال ہے؟"

کنیزوں نے کہا:

"ظلِّ سبحانی! شاید ہماری خدمت میں کوئی کوتاہی رہی ہو۔"

شہنشاہ نے نہایت نحیف آواز میں کہا:

"خیر..................! وزیرِ اعظم کو قدم بوسی کی اجازت دی جائے..."

پھر وزیرِ اعظم قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے۔

شہنشاہ نے کہا:

"کیا خبر لائے ہو؟"

"عالم پناہ...... وہ سر پھرا ہماری دسترس سے باہر ہو گیا۔"

"کیوں...... وزیرِ اعظم...... کیوں؟"

"وہ اُن کی پناہ گاہ میں چلا گیا جن کے مقابلہ اتنی کی وہ نگہداشت کر رہا تھا۔"

شہنشاہ نے اپنی دم توڑتی ہوئی چیخ میں کہا:
......"وزیر اعظم ہماری فوجیں... ہماری فوجیں"۔
لیکن وزیر اعظم جو کچھ کہنے والے تھے وہ بھی کیا کم دھماکہ خیز تھا!
"عالم پناہ...! وہ تو سر پھرا ہے، پرایا ہے... آج نہیں تو کل ہمارے چنگل میں ہوگا۔ لیکن جب اپنوں میں ہی کالا بھیڑیا ہوگا تب حالات پیچیدہ ہی نہیں مشکل بھی....!"
شہنشاہ نے اپنے سر پر رکھے ہوئے تاج کو مضبوطی سے پکڑا اور کہنے لگا۔
"ناقابل یقین!.....ناقابل یقین!!"
اُس دن کے بعد وادی کی تارکول سڑکوں پر فوج گشت کرنے لگی۔ اُسی دن ایک معصوم بچہ اپنے باپ سے پوچھا
"بابا! بندوق کیا ہوتا ہے؟"
"بندوق؟..... بندوق میں جب گولی رکھی جاتی ہے، اور لبلبی دبائی جاتی ہے تو اُس گولی سے آدمی مرجاتا ہے..."
"لیکن! آدمی کو کیوں مارا جائے؟" بچے نے سوال کیا۔
"اِس لئے جب کبھی آدمی دوسرے آدمی کا دشمن بن جاتا ہے.... تب... مظلوم آدمی ہاتھ میں

بندوق لیتا ہے!"
اب بچے نے ضد کی...
"بابا.... مجھے بندوق چلانا سکھاؤ"
اب بھی چوک میں نوجوان وقت کی رفتار پر
ضرب لگا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
"ہمارا مقصد صرف بڑا ہونا ہی نہیں
بلکہ اصل مقصد ہے.... بڑا ہو کے بڑا رہنا
ہوگا...!!!"
وادی میں ایک گول میدان بھی تھا جس کی
سرزمین نے نہ جانے کتنے انقلابات اپنے اندر چھپا
لئے تھے! آج وہاں سجائے گئے چبوترے کے
سامنے ایک قد آور آدمی کھڑا تھا۔ اُس کا
سر گنجا تھا... ناک لمبی تھی... کان کھڑے
تھے... وہ سامعین سے کہنے لگا...
"ہم وطنو! آج میں تم لوگوں سے
پہلی بار مخاطب ہو رہا ہوں.... آج
میں تم لوگوں کے پاس پہلی بار اس لئے حاضر
ہوا ہوں... کہ تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ آج
نہ میرا کوئی سرپرست ہے نہ میں کسی کی
سرپرستی قبول کرنے کے لئے تیار!"
اس شام وادی کی ایک بوسیدہ جھونپڑی میں
ایک بوڑھا آدمی اپنے نوجوان بیٹے سے پوچھ رہا تھا:
"بیٹا! تمہارا نشانہ کیسا ہے؟"

نوجوان نے اپنا سینہ تان کر کہا:

"بابا! رات کے اندھیرے میں اُڑتے ہوئے پرندے پر بند آنکھوں سے نشانہ لگا سکتا ہوں...."

باپ نے اپنے حقّے سے تمباکو کا لمبا کش لیتے ہوئے کہا:

"لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنی بند آنکھوں سے دشمن کو پہچان پاؤ گے بھی یا......؟"

چوک کے پیچھے واقع جو صدر اسپتال تھا وہاں سے ادھیڑ عمر کا سر پھرا نمودار ہوا۔ وہ چاق و چوبند لگ رہا تھا۔ اُس کے اعزاز میں جشن صحت کا اہتمام کیا گیا۔ اُس جشن میں اُس کے معالج نے کہا:

"اپنی صحت یابی کی خوشی میں تم اپنے معالج کو کیا پیش کر رہے ہو؟"

سر پھرے نے کہا:

"ڈاکٹر میں کل سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔"

وادی کی ایک بوسیدہ جھونپڑی میں بیٹا اپنے باپ کے حقہ کی چلم میں تمباکو رکھ رہا تھا بوڑھے نے نوجوان سے کہا:

"اب نشانہ لگانے کے لئے تیار رہو!"

"بابا!.... کیا پھر کھیتوں میں کوئی خونخوار جانور گھس آیا ہے۔"

"بیٹے..... انسان اور جانور میں بہت ہی کم فرق ہے.....!"

نوجوان نے اپنی بندوق ہاتھ میں لی... اس کی صفائی کی... پھر بندوق کی نالی میں کارتوس ڈالنے لگا۔

آج چوک میں تنومند نوجوان بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن چوک میں آج نہایت نظم و ضبط کے ساتھ گاڑیوں کے قطار در قطار کھڑے تھے۔ گاڑیوں کے اس قافلے کے سب سے آگے والی گاڑی میں نوجوان تھا۔ قافلہ کی روانگی کے وقت نوجوان نے چوک پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے آپ سے کہا:

"الوداع.....! الوداع......! میں آج بڑا بننے اور بڑا رہنے کی قربان گاہ پر اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں....."

وادی کے نوجوان لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنی بوسیدہ جھونپڑی کے صحن کو عبور کرتے ہوئے اپنے باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے اپنے باپ کا دامن.. پکڑتے ہوئے کمزور آواز میں کہا:

"بابا.....! وہ دس تھے اور میں اکیلا تھا۔ نو میرے نشانے سے بچ نہ پائے لیکن دسویں نے مجھے اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔"

باپ نے اپنے لختِ جگر سے لپٹتے ہوئے کہا:
"لیکن بیٹا! ابھی تو بہت آگے جانا ہے!"
"بابا..... بابا..... اللہ..... اللہ....."
نوجوان نے اپنے باپ کے بازوؤں میں دم...
توڑ دیا.....

بوڑھے نے نوجوان بیٹے کی لاش خود سپردِ خاک کی، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے گھر کے صحن کو عبور کرتے ہوئے اس کمرے میں پہنچا جہاں اُس نے دم توڑا تھا.....

وہاں اب بھی اس کے جوان بیٹے کی بندوق زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے زمین سے بندوق اُٹھاتے ہوئے کہا:

"بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔"
"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

●

اندراج

سنگِ مرمر میں ڈھلی ہوئی اس عمارت
کے سامنے ہزاروں افراد تعظیم سے سر جھکاتے
اور اپنے دل کی مُراد سے آگاہی اس اَن دیکھی
قوّت سے کرتے، جس کو تلاش کرنا بے سود
ہے۔ اور جس کا وجود مُعمّہ ہے۔

وہ معمول کے مطابق کلیسا
کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس دن
اس کو محسوس ہوا کہ کسی کا نحیف ہاتھ اُس کے
سر پہ تھا۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی نگاہ جو اوپر
کی تو اپنے سامنے کلیسا کے پیشوا کو کھڑا پایا۔
اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا:

"مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی میرے محترم!"
پیشوا نے اپنی شہادت کی اُنگلی سے آسمان کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا:
"وہاں سے معلوم ہوا کہ تمہارا نام آدمیوں کی فہرست میں درج پایا۔"
وہ حیرتوں کے پہاڑ تلے دب گیا اور بولا
"ناقابل یقین!"
پیشوا نے کلیسا میں واپس جاتے ہوئے کہا۔
"تمہیں منصب عالی مبارک ہو۔"
اس حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد وہ اپنے حالات پر قابو پانے کی سعی کرتا رہا اس نے پھر ایک بار عقل و فہم پر سبقت پائی۔ اس لئے اُسے سوچ نے بتایا کہ اس منصب عالی پر اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دینا ہوگا۔ یہ سوچ بذات خود ایک تھکا دینے والا عمل تھا۔ حقیقتاً وہ اپنے آپ اس منصب عالی پر اپنے آپ قائم رکھنے کے لئے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام پذیر دینا ہوگا۔ یہ سوچ بذاتِ خود ایک تھکا دینے والا عمل تھا۔ حقیقتاً وہ اپنے آپ اس منصب عالی پر خوش نہیں پا رہا تھا.....!
پھر ایک دن ایسا ہوا... کہ الف لیلیٰ سے ایک شہزادی چوری چھپے بھاگ کر اس کے گھر

کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی۔ پھر وقت کا سوداگر اس نازنین کو نیلام کرتا رہا۔

نازنین کو دیکھ کر اس نے کہا:

"میرے پاس رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا گھر ہے... پیٹ کے لئے دو وقت کی روٹی ہے۔ تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا ہے۔"

نازنین نے نوجوان کے یہ چند جملے بڑی غور سے سُنے۔ پھر وہ بنا کچھ کہے خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ کل تک جو راستے اس کے لئے دھند میں کھوئے ہوئے تھے آج وہ واضح ہو گئے۔

نوجوان کا گھر بے ترتیبی کا شکار تھا...

نازنین نے اس گھر میں قدم کیا رکھا کہ ہر چیز میں ایک ترتیب نظر آنے لگی۔ نظم و نسق نے اقتدار سنبھال لیا۔ وہ دونوں اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں رفعتوں کے قلعے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ایک نامعلوم منزل کی طرف گامزن ہوئے۔

پھر بہت دیر کے بعد انہیں احساس ہوا.... اِس نامعلوم منزل کو کوئی اچھا سا نام دیا جائے۔

اس دن بڑی تیز بارش ہو رہی تھی... بادل گرج رہے تھے... اور بجلیاں کڑک رہی تھیں نازنین اِس ہولناک ماحول سے اس قدر سہم گئی کہ وہ نوجوان کی چھاتی کے ساتھ چپک گئی

بالآخر وہ بول پڑی:

"مجھے میری منزل کا نام ملا۔"

نوجوان نے اس کی زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا:

"پاگل! دیکھ.....! فٹ پاتھ کے اُس پار..... وہ بڑی قد آور عمارت...... وہاں ہی تمہاری منزل ہے۔"

نازنین کی چیخ اُس ہیبتناک ماحول میں ایسی گونجی جیسے کسی سنسان جنگل میں تنہا گھر پر بجلی گر پڑی ہو۔

"مجھے تمہارے اِس بے مقصد کھوج اور سوچ دونوں سے انکار ہے۔"

نوجوان اپنے اس جلے ہوئے گھر میں دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے دل پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا۔ لیکن ________ صبر و تحمل سے کام نہ لے سکا۔

"تم نے میرے جذبے کو لہولہان کیا ...... نکل جاؤ...... یہاں سے نکل جاؤ.. اتنے دور میری نظروں سے ہو کہ مجھے پھر کبھی نظر نہ آنا"

نازنین پھر اس دنیا میں واپس چلی گئی جہاں سے وہ آئی تھی...

نوجوان نے جب اپنے غصّے پر قابو پایا ، صبر و تحمّل کی قبا کو دوبارہ اوڑھ لیا ... تو آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی لوٹ پڑی ... وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ وہ کتنا بڑا بزدل اور ناکارہ نکلا۔

وہ اپنے نام کو مجرموں کی فہرست میں صاف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو آدمیت کا قاتل سمجھ بیٹھا۔ اپنے دل کے اس اضطراب پر قابو پانے کے لئے کلیسا کے سامنے گھنٹوں سر جھکائے کھڑا رہا ۔۔۔ اچانک اُس نے اپنے پیروں پر کسی کے ہاتھوں کو مس ہوتے ہوئے محسوس کیا ۔ اُس نے بوکھلاتے ہوئے آنکھوں کو وا کیا تو کلیسا کا سب سے بڑا پیشوا اُس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔

وہ اپنے پاؤں ہٹاتے ہوئے بول پڑا ...

"محترم یہ کیا ۔۔۔؟"

لیکن پیشوا کو معلوم ہو گیا تھا کہ اب اُس کا نام انسانوں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے۔

ارتقا کا سانحہ

سورج سر پر آگیا۔ لیکن وہ بوڑھا ضعیف، ریش دراز آدمی اب بھی عبادت میں محو ایسے ہی آنکھیں موندے ہوئے تھا، جیسے وہ چھ گھنٹے پہلے تھا۔ وہ دونوں زانوں میں سر ڈالے ہوئے اس کے سامنے تھے۔ ان دونوں کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے متعلق فیصلے کا انتظار کر رہے ہوں۔ ماحول کی سحر انگیزی نے ان دونوں کو بت بنا کے چھوڑا تھا۔ ان میں ایک قد کا دراز تھا اس کی آواز میں مٹھاس تھی اور گفتار میں جادو کا اثر تھا۔ وہ

اپنے آپ کو شیر دل کہتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ہر غلط یا صحیح فیصلے پر اسی طرح اٹل رہتا تھا جیسے پتھر کی لکیر۔۔۔ دوسرا نوجوان قد کا چھوٹا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اکھاڑے کا شیر نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے آپ کو فہم و ادراک کا خزانہ سمجھتا تھا، اس لئے یار دوستوں نے اس کو مفکر کا نام عطا کیا تھا۔

جب سورج ڈھلنے لگا۔۔۔ آنے والے اندھیرے میں ضعیف ریش دراز آدمی نے ان دونوں کے سامنے سکہ پھینکا۔ وہ دونوں سکے پر جھپٹ پڑے۔ لیکن شیر دل فولادی بازو، پہلوانی جسم اور چٹان کی مضبوطی رکھتا تھا۔ اس لئے سکہ اس نے اپنے ہاتھ میں فوراً لے لیا۔ بعد میں جب دن کے اجالے میں اس کو معلوم ہوا کہ سکہ کھوٹا ہے، اس نے غصہ میں آکر بوڑھے ریش دراز آدمی کو لعنت ملامت کرنی شروع کی۔ اور غصے کی انتہا میں سکہ کو پھینکنے والا تھا کہ مفکر نے ہاتھ پکڑا اور کہا:

"کبھی کبھی برے وقت میں کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے۔"

اب تو قلعے تک پہنچنے کے لئے دونوں نے مہم کا آغاز کیا۔

حالانکہ قلعے تک کیسے پہونچا جائے اور وہاں کن کن دشوار گذار راستوں سے گذرنا ہوگا، اس

سے وہ دونوں بے خبر تھے۔ وہ انجام سے بھی بے خبر تھے۔۔۔ مگر ولولہ، جذبہ اور جوش اُن کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ شیر دل نے کھوٹے سکّے کو تصویر بنا کر اپنے گلے میں آویزاں کیا۔

پھر سفر میں کچھ ایسے مقام بھی آئے جہاں انسانوں کو نیزوں پر اُچھالا جا رہا تھا۔ شیر دل کے جذبات مجروح ہو گئے۔ اس سے یہ منظر دیکھا نہ جا سکا۔ اس نے اپنی سحر بیانی کو مفکّر کے مقولوں سے سجایا اور سنوارا۔ پھر اس بستی میں قہر نے سب کو اپنے ساتھ بہا ڈالا۔

شیر دل اپنے قبیلے کا سردار بن کے اُبھرا۔ لوگوں کے دلوں میں شیر دل کے لئے جب عزّت کا مقام ملا۔۔۔ تو اونچی خانقاہ میں بیٹھا ہوا بوڑھا پیشوا غضبناک ہو گیا۔۔۔

اس نے اپنے فوجی دستے کی مدد سے شیر دل کو گرفتار کرا کے خانقاہ میں اپنے سامنے پیش کرایا ۔۔۔۔۔۔ بوڑھے پیشوا کی شہادت والی انگلی حرکت میں آ گئی۔ تو شیر دل کو تختۂ دار کی طرف لے جایا گیا۔ لیکن کھوٹا سکّہ کھوٹا تھا۔ دِقت پر کام آ گیا۔ نہ صرف شیر دل کی جان بخشی کروائی بلکہ اُن کے سب سے بڑے دیوتا کا منصب بھی عطا کروایا۔

کل تک وہ ایک ادنیٰ فرد تھا۔۔۔ جو گمنامی کی دنیا میں ایسے بھٹک رہا تھا جیسے ایک دیوانہ

اپنی دیوانگی کے عالم میں اکیلے سفر کر رہا ہو، لیکن
آج منصب شاہی نے اُس کی ہر ادا میں ایک انوکھا،
نرالا اور دل فریب انداز بخش دیا۔ اب جب بھی وہ
آئینے کے سامنے اپنے سر پر تاج رکھتا تھا تو
آئینے سے کہتا تھا۔
"......میں... میرا سر... اور میرا تاج!"
اب رقاصہ کا رقص شروع ہوا۔ اس کے
بدن کا انگ انگ تھرکنے لگا۔ شہنشاہ اس کی
ہر ادا پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ فریفتگی نے جب دیوانگی
کا رنگ اختیار کرنا شروع کیا تو مفکر نے ٹوکتے
ہوئے کہا:
"اسے چھوا تو جا سکتا ہے، لیکن چکھا نہیں جا سکتا"
لیکن رقاصہ تو رقاصہ تھی، وہ دعوتِ عیش کو
بامِ عروج پر پہنچانے کا ہنر خوب جانتی تھی، وہ اپنا
ہر قدم ناپ تول کر آگے بڑھا رہی تھی پہلے پہل
اس نے اپنی کالی کالی آنکھوں کو الماس کی طشتری
میں سلیقے سے پیش کر کے شہنشاہ کو اپنے تخت پر
کھڑا کیا، لیکن بوڑھا پیشوا.... اپنے آباؤ اجداد
کی روایات کو توڑنا نہیں چاہتا تھا بلکہ ان کو اور
مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے شہنشاہ
کے حضور میں دو زانو ہو کر اپنے عصا کو تھامتے ہوئے
نہایت عاجزانہ آواز میں کہا:

"ہمارے آقا! ہمیں ایسی کڑی آزمائش میں نہ ڈالئیے... جہاں ہمارا صبر جواب دے جائے۔ ہماری عزّت ہمیں للکارتی رہے گی... ہمارے آقا! ہم سے ہماری اولادوں کی قربانی... مانگئے... جائدادیں مانگئے، ایمان مانگئے، لیکن ایسا فیصلہ نہ سنائیے جس سے قہر نازل ہو جائے"

شیردل آئینے کے سامنے اپنے تاج کی جھالروں کو ترتیب دے رہا تھا، لیکن مفکر... فکر اور پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شیردل مفکرؔ کی بزدلی پر زیرلب ہنس رہا تھا، اب مفکر سے نہ رہا گیا، اس نے کہا:

"مانا کہ تم دیوتا بنے ہو، لیکن تم انسان ہو.... ہزاروں خواہشات ہیں تمہاری، لیکن ایسی خواہش کا اظہار ہی کیا کرنا جو ہمارے ہی وجود کو ڈس لے۔"

لیکن رقاصہ کے پاؤں اب بھی فرش پر تھرک رہے تھے۔ نہ جانے وہ حسن کا جادو تھا یا رقاصہ کا فن کہ وہ بلندیوں کو چھونے لگی۔ اس نے اپنے گلاب جیسی پنکھڑیوں والے ہونٹوں کو نئے نئے زاویے اور موڑ دیئے۔ شہنشاہ دیکھتا رہ گیا۔ ایسے ہونٹ صرف پوجنے کے لئے ہوتے ہیں.... چکھنے کے لئے نہیں۔ لیکن وہ اپنی ابھرتی ہوئی خواہش کو سلا دینے والا صالح کہاں! اس لئے شہنشاہ اپنے روئے شریف سے گستاخ مکھی کو ہٹاتے ہوئے مفکر سے کہنے لگا:

اپنی دیوانگی کے عالم میں اکیلے سفر کر رہا ہو، لیکن آج منصب شاہی نے اُس کی ہر ادا میں ایک انوکھا، نرالا اور دل فریب انداز بخش دیا۔ اب جب کبھی وہ آئینے کے سامنے اپنے سر پر تاج رکھتا تھا تو آئینے سے کہتا تھا۔

"..........میں... میرا سر... اور میرا تاج!"

اب رقاصہ کا رقص شروع ہوا۔ اس کے بدن کا انگ انگ تھر کنے لگا۔ شہنشاہ اس کی ہر ادا پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ فریفتگی نے جب دیوانگی کا رنگ اختیار کرنا شروع کیا تو مفکر نے ٹوکتے ہوئے کہا:

"اسے چھوا تو جا سکتا ہے، لیکن چکھا نہیں جا سکتا"

لیکن رقاصہ تو رقاصہ تھی، وہ دعوتِ عیش کو بامِ عروج پر پہنچانے کا ہنر خوب جانتی تھی، وہ اپنا ہر قدم ناپ تول کر آگے بڑھا رہی تھی پہلے پہل اس نے اپنی کالی کالی آنکھوں کو الماس کی طشتری میں سلیقے سے پیش کر کے شہنشاہ کو اپنے تخت پر کھڑا کیا، لیکن بوڑھا پیشوا۔۔۔ اپنے آباؤ اجداد کی روایات کو توڑنا نہیں چاہتا تھا بلکہ ان کو اور مضبوط کرنا چاہتا تھا۔۔ اس لئے اس نے شہنشاہ کے حضور میں دو زانو ہو کر اپنے عصا کو تھامتے ہوئے نہایت عاجزانہ آواز میں کہا:

"ہمارے آقا! ہمیں ایسی کڑی آزمائش میں نہ ڈالیئے... جہاں ہمارا صبر جواب دے جائے۔ ہماری عزت ہمیں للکارتی رہے گی... ہمارے آقا! ہم سے ہماری اولادوں کی قربانی... مانگئے... جایدادیں مانگئے، ایمان مانگئے، لیکن ایسا فیصلہ نہ سنائیے جس سے قہر نازل ہو جائے۔"

شیر دل آئینے کے سامنے اپنے تاج کی جھالروں کو ترتیب دے رہا تھا، لیکن مفکر... فکر اور پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شیر دل مفکر کی بزدلی پر زیر لب ہنس رہا تھا، اب مفکر سے نہ رہا گیا، اس نے کہا:

"مانا کہ تم دیوتا بنے ہو، لیکن تم انسان ہو... ہزاروں خواہشات ہیں تمہاری، لیکن ایسی خواہش کا اظہار ہی کیا کرنا جو ہمارے ہی وجود کو ڈس لے۔"

لیکن رقاصہ کے پاؤں اب بھی فرش پر تھرک رہے تھے۔ نہ جانے وہ حسن کا جادو تھا یا رقاصہ کا فن کہ وہ بلندیوں کو چھونے لگی۔ اس نے اپنے گلاب جیسی پنکھڑیوں والے ہونٹوں کو نئے نئے زاویے اور موڑ دیئے۔

شہنشاہ دیکھتا رہ گیا۔ ایسے ہونٹ صرف پوجنے کے لئے ہوتے ہیں... چکھنے کے لئے نہیں۔ لیکن وہ اپنی ابھرتی ہوئی خواہش کو سلا دینے والا صالح کہاں! اس لئے شہنشاہ اپنے روئے شریف سے گستاخ مکھی کو ہٹاتے ہوئے مفکر سے کہنے لگا:

"ہم تو غلام ہیں روایات کے۔ روایت کو توڑنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ وقتوں سے چلا آرہا ہے... خاندان کا تصوّر! اِس تصوّر سے فرار ناممکن ہے... اور روایت سے انحراف کرنا دراصل خود کو نیست و نابود کرنے کے مترادف ہوگا۔"

مفکّر پہلی بار شیر دل کے سامنے تن کر کھڑا ہوا۔ اپنی دِھیمی مگر فیصلہ کُن آواز میں کہنے لگا:

"تلواروں کی نوک کب روایت کو برقرار رکھتی ہے۔ فہم و ادراک یہی کہتا ہے کہ ہمیں بدلتے ہوئے وقت کے تیور پہچان لینی چاہیئے... ورنہ بہتے دریا میں آیا ہوا طوفان اپنے ساتھ سب کچھ بہا کے لے جاتا ہے میرے دوست!"

"دوست!"

شیر دل کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں اُبھر آئیں۔

"میں تمہارا دوست نہیں ہوں، میں ----- تمہارا شہنشاہ ہوں... میرا اور تمہارا رشتہ ایک شہنشاہ اور مشیر کا رشتہ ہے۔"

مُفکّر گہری سوچ میں اِس لئے نہیں پڑا کہ اس کو دوستی کے کھو جانے کا غم تھا... ہاں... دوست کے ڈوب جانے کا غم ضرور تھا... یہ

سانحہ کیا کم تھا کہ جس دوست کو وہ ہر سرد و گرم سے بچاتا رہا وہ آج اس کی چھایا بھی نہ بن سکا۔

اب رقاصہ بھی رقص میں محو اپنے آپ سے بے خبر ہو گئی۔ اس کے بدن کے تمام حصے تھر کنے مٹکنے لگے۔ وہ مستی کو ہر رنگ میں پیش کرنے لگی۔ ایسا ہی منظر ہوش کو آگ لگا دیتا ہے۔ شہنشاہ سے اب رہا نہ گیا۔ وہ اپنی آواز میں پہلے والی گرج اور سحر بیانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے لگا جس کو وہ اپنا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھتا تھا۔ لیکن وہ سحر بیانی اب کہاں؟ شیرینی کہاں؟

وہ بوڑھے پیشوا سے کہنے لگا:

" پیشوا سن! میں نہیں چاہتا..... کہ میری موت کے بعد میری قوم صدیوں خون کے آنسو بہاتی رہے اور شہر، گاؤں گاؤں، اپنے دیوتا کی تلاش میں بھٹکتی رہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صدیوں سے چلی آرہی روایت کو توڑ کر ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈال دوں۔ ۔ ۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میرے جانے سے پہلے تمہارے لئے ایک دیوتا چھوڑ تا جاؤں! ... اس لئے یہ امر اب ضروری بن جاتا ہے کہ ہماری ایک ملکہ ہونی چاہئیے "

پیشوا! جس لڑکی کا ہم نے اِنتخاب کیا
ہے۔۔۔ وہ ہماری ملکہ بنے گی۔۔۔!"
پیشوا کے ہاتھوں سے عصا گر گیا۔ اور وہ اپنی کانپتی
ہوئی بوڑھی آواز میں کہنے لگا۔
"لیکن شہنشاہ عالی! جب سے ہماری تہذیب
وجود میں آئی ہے، تب سے دیوتاؤں کی شادیاں
آسمانوں میں ہوتی چلی آرہی ہیں۔۔۔!"
شہنشاہ اپنے تخت پر کھڑے ہو کر طیش
میں آکر ۔۔۔ کہنے لگا:
"پیشوا۔۔۔۔! میں تمہارا شہنشاہ ہوں اور
میرا ہر حکم بجا لانا تمہارا ایمان ہے۔"
پیشوا نے لڑکی سے کہا:
"بدقسمت! اب تمہاری قربانی کا وقت آگیا ہے۔"
اس کا یہ جملہ سُن کے سارا ایوان سکوت میں ڈوب
گیا۔۔۔ لڑکی تھر تھرا اُٹھی ۔۔۔ رقاصہ بھی تھک
کر چور ہو گئی تھی۔
بارہ سفید گھوڑے اس بگی کو چلا رہے تھے۔
اطلس اور کمخواب میں ملبوس وہ لڑکی اس بگی سے
اُتری۔۔۔ جس کے سر پر شیر دِل ملکہ کا تاجِ شاہی رکھنے
والا تھا۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم پر اسرار خاموشی
میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا۔۔۔ جیسے سب کے لب سی دیئے
گئے ہوں۔ اِس پُر اسرار ماحول میں صرف لڑکی کے
سسکنے کی آواز آرہی تھی۔

شہنشاہ نے ملکہ کے سر پر تاج رکھتے ہوئے
کہا ...

"ہم یعنی وقت کے سب سے بڑے
شہنشاہ نے تمہیں منصب شاہی عطا
کر کے تمہاری زندگی کو جاوداں کر دیا۔
ہماری ملکہ! ....
دُعا دو، اُس لمحہ کو، جب ہمارے
دل میں تمہارے لئے خواہش پیدا
ہوئی اور تمہیں خلوت میں جلوہ افروز
ہونے کے لئے پسند کر لیا۔"

وہ لڑکی اپنے ہی وطن میں ایک قیدی کی زندگی گذارنے کے لئے قربان گاہ میں سبھینٹ چڑھائی جا رہی تھی۔ وہ خوف سے، ڈر سے ... اور وہم سے کانپنے لگی۔ وہ شہنشاہ جو اُن کا دیوتا تھا، اُس کے لئے ملک الموت کی صورت اختیار کر گیا۔ وہ اُس کی روح کو اپنے قبضہ میں لینے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور وہ شہنشاہ کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے حصار سے اپنے آپ کو ... بچانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کیفیت میں وہ اپنے آپ کو آزاد کرنے کی جستجو میں لگی ہوئی تھی۔ جب بازوؤں کے حصار میں وہ بند ہو کے رہ گئی تو اُس کے لئے موت اب یقینی صورت اختیار کر گئی۔ اِس لئے اُس نے اپنے موتیوں جیسے سفید دانتوں سے تیز دھار والی

تلوار کا کام لیا... اور شہنشاہ کا بایاں کان کاٹ لیا۔ شہنشاہ تکلیف سے چیخ پڑا۔ اور اِسے اُدلئے دِلبرانا سمجھ کر نازنین کو اپنے بازوؤں کے حِصار میں لینے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن جب کٹے ہوئے کان سے سُرخ خون کی لکیر شہنشاہ کے رُخسار پر پھیلنے لگی تو بوڑھا پیشوا چیخ پڑا...

"لوگو! وہ دیوتا نہیں ہے... تم جیسا ایک معمولی حقیر انسان ہے!"

شہنشاہ نے جب لوگوں کا ہجوم اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو بوکھلا اُٹھا۔ اُس نے ملکہ کو ایک طرف ڈھکیل دیا اور اس قہر سے بچنے کے لئے فرار کا راستہ اختیار کرنے لگا۔ تو مُفکّر نے اُسے روکا اور کہا:

"اب وقت تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے
اب تم وقت کے ہاتھ میں ہو... لیکن...
وقت اب بھی تمہارے ہاتھ میں رہے گا،
ایک حقیقی شہنشاہ کی طرح موت
کو لبّیک کہو۔"

کتنے ہی اوراق سیاہ ہوگئے!... اب تو کہانی کا اِختتام ہوا۔ انقلاب آتا ہے اور سب کو روند کے چلا جاتا ہے... لیکن مُفکّر اب بھی بستی بستی، گاؤں گاؤں، شہر شہر اُس فرد کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے سر پر تاج رکھا جائے۔



آدھے اُدھورے

جب ہم اپنی سوچوں کو قتل کر کے یہ فرض
کر لیتے ہیں کہ ہمارے پاس سوچنے کو کچھ بھی نہیں
رہا... پھر اس سوچ کو کیونکر سوچ مانا جائے،
کہ آدھی تصویر بھی دراصل مکمّل تصویر ہے۔
تصویر میں پچیس رنگ ہوں پھر بھی نامکمّل ہو؟
کیا یہ المیہ نہیں اور صرف آدھی تصویر کا عنوان
چپکائے پھرے.. ایک بوجھ ہے۔ اور بوجھ جب
پہچان بن جاتا ہے تو ہم اپنی تمام سوچوں کو قتل
کر لیتے ہیں۔

نجات دہندہ کے ہاتھ کاٹ کر پھینک دو۔ کیونکہ وہ فولادی ہاتھ بھی ہاتھ نہ تھے۔ اگر وہ مکمل ہوتے تو تصویر میں صرف ایک رنگ ہوتا۔

جب وہ لحاف میں اپنی نامکمل تصویر چھپاتا ہے تو اس کا شعور سو جاتا اور لاشعور جاگ پڑتا ہے۔ اور اس کو ساری دنیا اُلٹی نظر آتی ہے جو صرف ایک ہی ٹانگ پر کھڑی ہر آدمی کے اوپر آدھی تصویر چپکاتی معلوم ہوتی ہے اور وہ، صرف وہ مکمل نظر آتا ہے۔

یہ عیب بھی ہے، نقص بھی اور جرم بھی عظیم ہونے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اژدھا دھیرے دھیرے اس کی طرف سرکتا رہا۔ اور وہ بھاگتے بھاگتے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ نوکیلے پتھروں نے اس کو لہولہان کر دیا۔ پیاس شدید تھی اور پانی کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔ لہو تو بہتے ہی جم جاتا ہے۔

چمار کے بیٹے کو بڑی ہنسی آئی۔ کہ تصویر تو ادھوری ہے۔ یہ ہنسی کب اپنی ذات پہ طنز کرتی نظر آئے۔ کیا معلوم۔ ادھوری تصویر کے پس منظر میں شاہکار کا تصور بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے۔

کیا یہ سانحہ نہیں، کہ کبھی کبھی مصور کو اپنی اپنائی ہوئی تصویر پر شدید غصہ آئے۔ کیونکہ ممکن ا

ہے اس کے تصوّر سے بھی نامکمّل تصویر کے کچھ نازک گوشے چھپے ہوں۔ پس منظر کا شاہکار سب کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ بہت نزدیک یا بہت دور سے بھی جو نامکمّل تصویر کو دیکھے۔ افسوس ہی کا اظہار کر سکتا ہے۔ اور نامکمل تصویر چوٹ کھا کر چکنا چور ہو جاتی ہے۔ بکھر جاتی ہے۔ اور اپنی محرومی میں کسی کو شریک کرنے کی روادار نہیں۔ ہونٹوں پر جو مسکراہٹ صدیوں میں اُبھرتی ہے، اس کو خود ہی قتل بھی کر دیتی ہے۔

تصویر کے نازک پہلو جب اُبھر کر سامنے آتے ہیں تو تعریفوں کا ایک نہ ختم ہونے والا پل باندھا جاتا ہے۔

آرٹ گیلری سے اَدّھا برابر اُس کے تعاقب میں تھا۔ اَدّھا نے اس کو عجیب سُنہرے خوابوں میں مبتلا کیا۔ اور وہ اپنے ادھورے پن کی حقیقت بھلاتا رہا۔ محل بھی تعمیر ہوا۔ خوبصورت باغیچہ بھی ترتیب دیا گیا۔ رنگین پردوں کی سرسراہٹ بھی ہلکی موسیقی میں تحلیل ہوتی گئی۔ خوابوں میں فردوس کی کیفیت بھی سمٹ آئی، لیکن وہ سب کے سب شیشے کے تھے۔ اَدّھا کی ایک ہی جھنکار نے منتشر کر دئے۔ شیشے چبانے کی آواز اب تک آ رہی ہے۔

اچانک آدھی تصویر میں آنکھیں اُبھر آئیں۔۔۔ آنکھوں سے دو آنسو گرے اور کینوس میں ا

جذب ہو گئے۔

اژدھا کے طلسمی رنگ رات کی سیاہی میں ڈھلنے لگے۔ اور وہ جزیرہ جس میں وہ قید تھا، زندگی سے کٹ گیا۔ وہ دوڑتا رہا۔۔ اور اژدھا اس کے پال و پر نگلتا رہا۔

وہ دھندلکوں میں اپنی پہچان ڈھونڈنے لگا۔ قافلے کو اپنے ساتھ لے جانا یا اپنے ساتھ لے جانے کا حوصلہ پیدا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ وہ اسے دور تک لے جانا چاہتا تھا۔ بہت دور تک ـــــ جزیرہ کا جو عکس اُبھرتا رہا، ڈوبتا رہا وہ اس کو تختۂ دار پر کند تیغ کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن جس قافلے کا وہ غم گسار رہا۔ جس قافلے کی ایک ایک خوشی کے لئے وہ صدیوں روتا رہا۔ اس قافلے کے ہر فرد نے اژدھے کی صورت اختیار کر لی۔ اور اس کی ذات کا سب سے بڑا کرب یہ تھا کہ وہ خود بھی اژدھا بنتا جا رہا تھا۔

آرٹ گیلری سے تعاقب کرتا ہوا اژدھا اب بھی برابر پھنکارتا جا رہا تھا!

●

کرچیوں کا سفر

آپ بھی ایک بھلے آدمی کی طرح ہم سے
ہمدردی، محبّت اور غمگساری کے ساتھ پیش آنے
کی کوشش کریں گے۔ اور ہم آپ کے اس سلوک
کے عوض آپ کو شہر کے چوراہے میں سولی پر
لٹکانا چاہیں گے۔
وقت کی کرشمہ سازی کو کوئی کیا کرے۔ کہ جس
آدمی کو ہم سولی پر لٹکانا چاہتے تھے وہی شہر کے
بڑے بازار میں اپنے ہاتھ میں چابک لئے ہماری
پیٹھ پر عجیب سے نشانات تراشتا ہوا ہم سے بار
بار کہہ رہا ہے کہ نظم کا عنوان تجویز کریں۔

جادوگر کے ہاتھ میں جادوئی چراغ ہو اور
آپ اُسے پہچان نہ پائیں تو اس میں جادوگر کا کیا
قصور ہے۔ ماتم کیجئے اور ہو سکے تو اپنی آنکھوں کو
جیب میں رکھ کر دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش
کیجئے کہ آپ کا وجود ابھی تک جادو میں قید ہے۔
سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ جو شخص شہر کے
چوراہے میں شیشے کا چراغ ہاتھ میں لئے پھر رہا ہے
اس کو سنگسار کیا جائے۔ کیونکہ سورج اب تک سر
پر ہے۔
عقل کے اندھو! تمہاری بصارت کے ساتھ
تمہاری قوتِ گویائی بھی سلب ہو گئی ہے۔ کب تک
نظم کو تصویر بنا کے اپنے گلے میں لٹکائے پھرو گے۔
وہ جو تم نے شہر کے چوراہے پر سولی کھڑی کر دی
ہے۔ اور بار بار اعلان کرتے پھر رہے ہو کہ خدا کو
پھانسی پر چڑھانا ہے۔ تمہاری کم ظرفی کی دلیل
ہے۔ کہ خدا کو اب بھی حق و باطل کے رمز میں مبتلا کر
رہے ہو... کب تک اپنی شخصیت کو کچلتے رہو گے؟
اس آواز کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ برداشت!
اور اگر برداشت سُرخ نشان کو نگل جائے تو وہی
آدمی جس کو کچلنے اور دبانے کی کوشش کی جاتی ہے،
آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح پھوٹ پڑتا ہے
اور شہر کے بڑے بازار میں شیشے کا چراغ ہاتھ
میں لئے چلا جاتا ہے۔

"مجھے پہچان لو، میں وقت کی آواز ہوں، میں تم میں ہوں اور تم مجھ میں ہو۔ نوزائیدہ بچّوں کی مقدّس روح اپنے اندر رکھتا ہوں۔ میں برف کی نرمی رکھتا ہوں اور شبنم کی نمی بھی، صبح کی خوشبودار ہوا کا پہلا جھونکا میں ہی ہوں۔ میں سورج کی آنچ بھی ہوں۔ اور لُو کی تپش بھی، وقت نے میرے سینے میں زہریلے ناگ بھر دیئے ہیں۔ اور میں اسی سینے میں اندر سے آنے والے طوفان کو دبائے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنا لو، ورنہ وہ بلائیں جو تم لوگوں سے دور رہی ہیں، تم کو آ گھیریں گی۔ کیونکہ میرے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ہاتھ پہ رکھا ہوا چراغ گر کر ٹوٹ جائے۔"

—— اس کا قہقہہ بہت بھیانک تھا۔

اپنے شہر کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ درویش تھا۔ نہیں —— درویش ہے۔ کل درویش تھا۔ تو آج پیغمبری کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے۔ کل "من نے خدا؟" بھی کہے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ممکن ہے آنے والے دنوں میں وہ صرف فلسفی ہو کر اپنی شناخت کرائے۔ کیونکہ وہ بے رحم اپنی شخصیت کو خود ہی یہ روپ عطا کرتا ہے۔ اور خود ہی اپنی شخصیت کو کچلتا رہتا ہے۔ لیکن اپنے شہر کے لوگ بڑے معصوم ہیں۔ کہ اس کے ہر بہروپ پر ایمان لاتے ہوئے بھی اپنے احساس کی آسودگی کے لئے اس شخص کو شہر کے چوراہے میں پھانسی پر لٹکانے پر متفق ہو گئے۔ ایسا شاید اس شہر کی تاریخ

میں پہلی بار ہوا تھا۔ کہ سب لوگ ایک ہی رائے اپنائیں۔
اور جب اس کو پھانسی پر لٹکا یا گیا تو آسمان
سے بجلیاں کڑ کیں۔ بھیانک طوفان اُٹھے ۔۔۔۔ زمین کا
سینہ دہل گیا۔ عمارتیں مسمار ہو گئیں۔ لوگ بہت
روئے، خون کے آنسو روئے۔ اور اس آفتِ
ناگہانی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن۔۔۔۔
اس شخص کو وقت کے چرخ نے خدا بنا
دیا تھا۔ شاید اسی لئے آج بھی اس چوراہے سے جہاں
اسے پھانسی دی گئی تھی، پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔
اور انسان کتنا کم ظرف ہے کہ اپنے نفع یا نقصان کے
لئے بہروپیے کو خدا کا درجہ بھی دے دیتا ہے۔ اور
اپنے چہرے کے اوپر خول چڑھائے رہتا ہے۔ کہ اس
کی شناخت ناممکن ہو۔ اور جب ہمارے قریب ہوتا
ہے۔ تو اپنی ہمدردی، محبت اور غم گساری کا کچھ اس
طرح اظہار کرتا ہے کہ بڑے پیار سے ہمارے زخموں
پر نمک چھڑکتا ہے۔ اور ہم ہی سے اپنی اس ادا کے
لئے داد طلب کرتا ہے۔ اب ہماری ہی کم ظرفی ہے، کہ ہم
اس حرکت کو شفقت کا جامہ پہناتے ہوئے بھی
اس سے محظوظ نہیں ہو پاتے۔ اور یہ دوسری بات ہے
کہ آج جو بھی شخص ہم سے ہمدردی یا انکساری
سے ملنے کی کوشش کرے، ہم اس کو پھانسی پر
چڑھا دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ کل ہی کی تو بات ہے
کہ جس شخص کی پرستش میں سالہا سال بتائے اور

اُسے خدا کا درجہ دیا۔ آج اس کو قبر سے نکالنا ہے اور شہر کے چوراہے میں سولی پر لٹکانا ہے، کیونکہ ہمارے پاس نظم آ گئی ہے، عنوان آ گیا ہے، اور ہم نے نظم کو تصویر بنا دیا ہے۔

اور جب اس شخص کو شہر کے چوراہے میں سُولی پر لٹکایا جائے گا، تو شیشے کا چراغ ہمارے ہاتھ میں ہو گا، اور ہم اپنی شخصیت کو ہر لمحے نت نئے روپ عطا کریں گے۔

کیا تم ہمیں پہچان پاؤ گے ــــ!!

اندھا کنواں

آج رات مجھے ایک کنواں کھودنا ہے۔ آگ لگنے والی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں ساری زمین اندھی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کنواں اندھا نہیں ہوگا۔

تھوڑی دیر پہلے جب میں بس اڈے کے پاس کھڑا تھا، چلتے پھرتے پتھروں کے جھرمٹ میں اپنے آپ کو بے بس پا رہا تھا۔ ایک چمڑے کا بیگ ایک خوش پوش آدمی کے ہاتھوں میں لٹکا ہوا نظر آیا تھا۔ اس پر "لُو۔ کے" کے دو حروف لکھے تھے۔ چمڑا چمکدار تھا۔ بیگ کی بناوٹ نفیس تھی۔ اس

کی سُرخ ٹائی بار بار ہوا میں جھومتے ہوئے اُس کی گردن سے لپٹ جاتی تھی۔

"ایک روپے سے لکھ پتی بن جائیے!" لاٹری ٹکٹ فروخت کرنے والے کی آواز میرے کانوں کو بوکھلا کر رکھ دیتی تھی۔

اور کالے چمڑے کا بیگ بار بار میری نظروں کے سامنے آتا تھا۔ وہ بیگ چھوٹا نہیں تھا۔ اچھے خاصے سائز کا وہ بیگ تھا۔ اور سوٹ والا آ بنے محتاط قدم سڑک پر ڈالتے ہوئے ایک تنگ و تاریک گلی میں گھُس گیا۔ اس کے پاؤں میں کچھ گر تھی۔ وہ بیچ بیچ میں لنگڑا کر چل رہا تھا۔

میری لاٹری نکلنے والی تھی!

وہ ایک پان والے کی دُکان کے سامنے رک گیا۔ شاید ایک سگریٹ کی ڈبیہ اور ایک ماچس کی ڈبیہ خرید لی۔ اس نے سگریٹ سُلگایا۔ میرے پاس ایک ادھ جلا سگریٹ تھا، لیکن دیا سلائی نہ تھی۔ اُس نے ماچس کی ڈبیہ ہوا میں اچھالی، جیسے اس میں کی بقیہ تیلیاں اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ میں ڈبیہ پر قابض ہو گیا۔ اور تڑے مُڑے سگریٹ کا دھواں میری نس نس میں خوشبو بھر گیا۔

بھوک کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے!!

کل کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہونا چاہیئے، ورنہ جان سے ہاتھ دھو لینا پڑے گا۔ مگر وہ چمڑے کا بیگ......!

میں سمجھتا ہوں اور مجھے یقین پر یقین ہے
کہ کل کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں
—— اگر کوئی دوسرا سجھو کا نہیں ہوا۔
وُہ آدمی کہاں گیا؟
او..... دو چار قدم مجھ سے آگے نکل پڑا.....
بے وقوف! میری نظر سے دور نہ ہو۔
مجھے تمہارا یہ چمڑے کا بیگ ہلانا بڑا پیارا لگتا
ہے۔ ایک آوارہ کُتا اس کی ٹانگ سے لپٹ گیا۔
وہ کتّے سے اُلجھ گیا۔
"کمبخت چھوڑ میرا پیچھا!"
اس کی بھدّی آواز رات کی خاموشی میں اُبھری۔
اَب وہ آوارہ کُتّا میرے پاس آکر کھڑا
ہوا۔ لیکن میرے پاس کیا تھا ——؟
بے چارا مایوس منہ لے کے چل دیا۔ اس کے
پاس چمڑے کا بیگ تھا۔ اور میرے پاس خالی
جیبیں....!
بار بار مجھے یہ خیال آرہا تھا کہ تیز رفتار دوڑ
لگاکے اس کے ہاتھوں سے چمڑے کا بیگ چھین
لوں۔ اور آناً فاناً غائب ہوجاؤں۔ مگر ہمّت بار بار
جواب دے رہی تھی۔ وہ بے وقوف اس طرح
آگے جارہا تھا جیسے کوئی خوف اور ڈر نہیں تھا۔
جانے پہچانے راستے اور ماحول ... رات کے مہیب
سنّاٹے میں بھی وہ بھکاری لڑکا اس گلی کے اختتام

پر اپنا راگ الاپ رہا تھا۔

"بابو جی... ایک پیسہ!"

اس خوش پوش آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ جیب میں گیا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے اس بھکاری لڑکے سے کہا:

"میری ٹائی چوم لو!"

وہ بھکاری تھا۔ مجبور تھا۔ اس کے پیٹ میں میری طرح چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس نے ٹائی چوم لی۔ خوش پوش آدمی نے اس کے ہاتھ پر ایک چونی رکھ دی۔ وہ لڑکا دوڑتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ اب ہم دونوں ایک تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوئے۔ وہاں اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا کہ آدمی اپنے آپ کو کھوئے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

وہ آگے تھا! میں پیچھے تھا!!

پھر اچانک میرے پاؤں کے نیچے کچھ آ گیا وہ ایک پتھر تھا۔ دوسرے لمحے اس آدمی کے پھسلنے کی آواز آئی۔ نہ جانے میرے ہاتھوں میں وہ پتھر کب اور کیسے آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ آدمی سنبھل جائے.... میں دوڑتے ہوئے اس کے سر کے اوپر پہونچ گیا ... اور دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے سر پر پوری قوت سے وہ پتھر مارا۔ اس کی چیخ بھی منہ سے نہ نکل پائی، میں نے خاموشی سے اس کی لاش اپنے کندھے پر رکھ لی اور ایک ہاتھ سے چمڑے کا بیگ سنبھال لیا۔

میرا تمام بدن پسینے سے تر بتر تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں کو پار کرتے ہوئے میں وہاں پہنچ گیا۔ جو میری منزل تھی... دریا کا خوفناک شور میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ میں ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا اور پھر میں نے اس لاش کو پوری قوت کے ساتھ دریا میں پھینک دیا... وہ لاش پانی کے ساتھ بہہ گئی۔ یہاں تک کہ میری نظروں سے غائب ہو گئی۔

اب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور دوڑتے ہوئے ایک سرکاری بجلی کے کھمبے کے پاس پہونچ گیا۔ میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بیگ کے بٹن کھولنے لگا... بٹن کھلتے ہی میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا...

وہاں ہرے ہرے نوٹ نہیں تھے... صرف کاغذ کا ایک ورق تھا۔ شاید ڈرافٹ یا چیک ہو، اس خیال کے تحت میں نے تہہ کیا ہوا کاغذ کا ورق کھولا... وہاں بڑے بڑے حروف میں صرف چند الفاظ تحریر تھے.....

"آج کی رات اس شہر کو آگ لگ جائے گی۔"

اب مجھے ایک کنواں کھودنا ہے۔ میں جانتا ہوں، ساری زمین اندھی ہے۔ مگر مجھے اعتماد ہے وہ کنواں اندھا نہیں ہوگا۔

●

کہانی کا آسیب

پھر میرا چہرہ موم کی طرح پگھل گیا۔
میں نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا دیا۔ کیونکہ آئینے نے پہچاننے سے انکار کیا تھا۔
کہیں یہ کہانی کا آسیب تو نہیں۔
زندگی کے طویل سفر میں اچانک ایک روز عمر دعیار سے ملاقات ہوئی۔ انڈین کلاسیکس کے مرکزی کردار سے ہزار باتیں ہوئیں لیکن کچھ بھی پلّے نہ پڑا۔ اگر یاد رہا تو صرف اِتنا کہ ایک روز ایک بادشاہ اپنے کمرے کی دھند میں غائب ہوگیا، اور چلاتا رہا، میں کہاں ہوں، مجھے تلاش کرو۔ میں نے یقین نہ کرتے ہوئے

کہا:

کہیں یہ کہانی کا آسیب تو نہیں۔
اس کے میک اَپ شدہ چہرے پر میں کچھ بھی نہ پڑھ سکا تھا۔ اور اپنی زنبیل سے اس نے گلیم نکالی۔ میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھا اور گلیم اوڑھ لی۔
میرے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ تھا۔
شاید وہ کتاب کا اٹھارواں صفحہ رہا ہوگا۔ لڑکی کے حسن کے سامنے الف لیلوی شہزادیوں کی نفاست اور حسن ماند پڑتا تھا۔ لیکن لڑکی کی زندگی میں آرام و آسائش میسر نہیں تھی۔ کہ وہ خود کو شہزادیوں میں شمار کرے۔ لڑکی فلک بوس عمارتوں میں نرم گدیلوں پر سونے، امپالا گاڑی میں گھومنے، ایر انڈیا کے جہازوں میں اڑان بھر کر سوئٹزرلینڈ کی وادیوں میں سیر کرنے، قیمتی ملبوسات استعمال کرنے، زندگی کے بارے میں مفکروں کی طرح سوچنے کے خواب دیکھ سکتی تھی۔

لیکن خواب ___ خواب حقیقت میں بدل جائیں گے یہ بھی اس کو یقین تھا۔ اس لئے ایک دن جب لڑکے نے اس سے کہا:
"آؤ ہم دو ایک ہو جائیں۔"
تو لڑکی نے طنزیہ انداز میں ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا:
"دو کو دو ہی رہنے دو۔ ہو سکے تو چھت کی

مرمّت کرا لو، ورنہ اب کے ساون کی بارشوں میں مکان بہہ جائے گا۔"

اور کتاب کے ۲۵ ویں صفحے پر لکھا تھا:

ایک دن بہت زوروں کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اور ایک لڑکی بس اسٹینڈ پر آدھے گھنٹے سے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنے رومال کا پنکھا بار بار اپنے مُنہ کے سامنے کرتی ۔ شاید گرمی کا احساس کم کر رہی تھی۔ اتنے میں شہر کی واحد رولس رائیس گاڑی وہاں آ کر رُک گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھُل گیا اور لڑکی بڑی عجلت میں دعوت ملے بغیر ہی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شاید اُس کو ڈر تھا کہ کہیں کوئی دوسری لڑکی گاڑی میں نہ بیٹھ جائے۔ گاڑی چل پڑی —،

"تو ہم دو سے ایک ہو جائیں گے۔" لڑکی نے کہا۔

" یہ غلط فہمی کیوں کر ..." لڑکے کا لہجہ تیز تھا نہ دھیما۔

" گاڑی جو آپ نے میرے لئے کھڑی کر دی۔" لڑکی کی آواز میں اعتماد تھا۔

گاڑی رک گئی۔

" آپ کا مکان آ گیا ہے۔" لڑکے نے کہا۔

" آیئے اندر آیئے" لڑکی نے دعوت دی۔

"لگتا ہے اب کے ساون کی بارشوں میں مکان بہہ جائے گا۔ میں کیسے مکان میں آسکتا ہوں۔" لڑکا دھیمی آواز سے بولا۔

لڑکی خاموش تھی۔ لڑکے نے قہقہہ بکھیرتے ہوئے کہا: "یہ لو! تین ہزار روپے اور چھت کی مرمت کروا لو۔" اور زن سے گاڑی آگے بڑھ گئی۔

لڑکی نے ایک نظر آسمان کی طرف، ایک مکان کی طرف اور ایک نوٹوں کی طرف ڈالی۔

اللہ دین کے چراغ سے ایک خط برآمد ہوا۔ لکھا تھا:

"دوسروں کے مرنے پر افسوس وہ کرے جس کو خود مرنا نہ ہو۔ اور جو خود پل پل مرے، اور پل پل مرنے کے بعد زندہ ہو، اور اپنی نئی زندگی میں اپنی پچھلی موت پر افسوس کرے، وہ قریب آگہی میں مبتلا ہے۔ ہمارے پاس کیا کچھ نہیں۔ کیا یہ بھی ایک سانحہ نہیں کہ ہمارے پاس سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں، ہم تو پرزے ہیں، چھوٹے چھوٹے پرزے۔ مشین پر کون بیٹھتا ہے، کیا کبھی معلوم ہو سکا ہے۔"

کتاب؟

اللہ دین کا چراغ؟

چراغ سے برآمد ہونے والا خط؟

اور عمرو عیار؟

کہیں یہ سب کچھ کہانی کا آسیب تو نہیں ؟
عمر و عیار مجھ پر جھپٹ کیوں پڑا ہے ؟
کیوں ؟
میرے ہاتھ خالی کیوں ہیں ؟
میں سڑک کے اگلے موڑ پر تنہا کیوں کھڑا ہوں ؟
کیا میری کوئی انفرادیت نہیں ؟
کوئی وجود نہیں ؟
کیا میں مشین کا پُرزہ ہی ہوں، جو گھِس جائے تو پھینک دیا جائے گا۔
کیا میرا کردار ہی میرا المیہ ہے ؟
میری پہچان کیوں نہیں ؟ کیا اِس لئے کہ میں بھی بھیڑ میں سے ایک ہوں ؟
پھر میرا چہرہ موم کی طرح پگھل گیا۔
میں نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا۔
کیونکہ —
آئینے نے مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تھا !!



بُت پرست

برُش نے بے ترتیبی سے کاغذ پر رنگ پھیلانا شروع کیا۔ اس بے ترتیبی میں اَن لکھے اَشکال کاغذ پر اُبھرنے لگے۔ وہ سب میرے پیچھے دوڑتے رہے۔ اور میں بھاگتا رہا۔ لیکن اس دوڑ میں بھی وہ آواز میرا تعاقب کرنے لگی۔

”رضنو! ذرا بازار سے کھٹے آم لانا۔“

میں خود سے الجھ پاتا ہوں اور جھنجھلاہٹ میں چیخ پڑتا ہوں۔

”فزی! میری لکیریں درست نہیں ہو پاتیں!“

”بے وقوف! لکیروں میں نہ اُلجھ.... آم لا.. ......آم لا......!“

کوئی جب رنگوں کی دنیا میں اُلجھ جائے تو
اس اُلجھن میں سیاہ رنگ کا ڈھونڈ نکالنا
دِل گرُدے کا کام ہے۔ لیکن جب اپنا ہی ہوش
بغاوت کرنے پر تُلا ہوا ہو..... پھر آدمی ایک
تماشائی بن کر رہ جاتا ہے... میرا برش صرف
سُرخ رنگ میں ڈوبتا رہا۔ میں بھاگتا رہا لیکن
سُرخ رنگ سے فرار ناممکن تھا۔

ایسے میں ایک آواز بہت دور سے آئی۔
"رضو! میں جا رہی ہوں... رونا نہیں!"
میں تو بس ان ہاتھوں کو دیکھتا رہا جو
سُرخ رنگ میں رنگے گئے تھے۔
"فزی! تمہارے ہاتھ کیسے خون میں رنگ گئے؟"
وُہ مجھے سینے سے لگائے بہت زور زور سے
رونے لگی۔
"رضو! میں نے اپنے ہاتھوں سے خود اپنا
خون کیا!"
میں پریشان ہو اُٹھا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز
میں کہا: "لیکن فزی! آج تو میں نے سات لکیریں
ترتیب سے کھینچی!"
"پگلے!" فزی نے مجھے چومتے ہوئے کہا۔
"اب سات سے بات نہیں بننے والی

بینٌ ہونی چاہیئے بینٌ!
ہے ۔۔۔ ہمیں تو پھر آواز کی دنیا میں کھو کے رہ گیا۔
بینس کی گردان کرتا رہا ۔ فری کی وہ آواز سوز میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میری تلاش کا موضوع بن گئی۔۔۔۔
ہاں ۔۔۔ ایک سوال بار بار ذہن میں ابھرتا تھا کہ یہ تلاش کیوں اور کس لئے۔۔۔۔ اور پھر جب ایسے موقعوں پر خود سے بھی خوف کھانے لگتا تھا۔ تو میں اپنے برش کی پناہ میں آجاتا تھا۔
۔۔۔۔ برش آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے کسی کے پیچ و خم میں اُلجھ جاتا ۔۔۔ یہ آنکھ مچولی بھی دل لگی کی موجب بن گئی۔

وہ کہنے لگی ۔۔۔

"رضنو ۔۔۔ میرے ۔۔۔ قریب آؤ۔"

"۔۔۔ فری ۔۔۔ یہیں کہیں کسی کونے میں چھپی ہوئی ہے۔"

وہ بالآخر چیخ پڑی۔

"فری! ۔۔۔۔۔ فری! کب تک!"

یہ سوال میں خود سے بھی بہت دنوں کرتا رہا لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ پا سکا۔ میں صحرا صحرا بھٹکتا رہا ۔۔۔ پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ احساس کانٹے کی طرح چبھتا رہا ۔۔۔ میرے پاؤں زخمی ہو گئے تھے ۔ میں تھک کر چور چور ہو گیا تھا۔

اب تو میں نے اپنے ارادوں میں ستگ کی

مضبوطی بخش دی۔ میں فزی کے بنے ہوئے جال سے آزادی حاصل کرنے کے لئے تیار ہو بیٹھا۔ یہ میری جُراَت کی اِنتہا تھی۔

پھر ایک دن تصویر بن کر میری تصویر کا ذکر کچھ یوں کرنے لگی کہ جیسے مجھ کو مجھ سے روشناس کرا رہی ہو۔ اس تصویر کی عبارت کچھ یُوں تھی، ......کہ مجنوں لیلےٰ کی تلاش میں تھکا ہارا صحرا کے بیچ میں کھڑا اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا...جھُرّیاں گِن رہا تھا!

وہ کہنے لگی:

"حقیقت نگاری کے ایسے نادر نمونے بہت کم ملتے ہیں ...!"

میں نے پاس آ کر کہا:

"لیکن ایسے لمحے کو قید کرنے کے لئے بہت لمبا سَفر طے کر کے آیا ہوں۔"

"تھک گئے ہو کیا؟"

"تھک گیا ہوں ... لیکن ایک نئی اُمنگ کی تلاش میں ہوں"

جانے کیوں پہلی بار میں الفاظ پر گرفت نہیں پا رہا تھا... جیسے کچھ کہتے کہتے کچھ اور کہہ جاتا... بس میں تو صرف پکارتا رہا...

"منی! ...... منی ......!!"

پھر میں خود سوچتا رہا... اور خود ہی اپنی سوچ کو ترتیب دیتا رہا۔ لیکن منی میری تصویر دل میں خود کو چھپاتی رہی۔

اس دن اُس نے ڈوبتے ہوئے سورج کی منظر کشی کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا ہر پہلو لاجواب ہے... حضور! میں آپ کے فن کے ہر پہلو سے بہت متاثر ہوئی ہوں... مجھ ناچیز کی طرف سے یہ تحفہ قبول کیجئے"

میرے ہاتھوں میں پہلی بار رعشہ طاری ہوا۔ اُس نے میرے ہاتھ میں صندل کا عصا تھما دیا۔ پھر وہ قمری جس کو منوں مٹی کے نیچے سُلا کے آیا تھا... میرے کانوں میں آکر کہنے لگی:

"رجنو...... ذرا بازار سے کچھ آم لا!!!"

بڑا دروازہ

بڑی حویلی میں رہنے والے سب کے سب افراد لوہے کے پتلے تھے۔ بڑی حویلی کا صدر دروازہ کسی پُرانے قلعے سے اُٹھا کے کھوئی ٹ میں نصب کیا گیا تھا۔ اس مضبوط قدآور دروازے نے نہ جانے کتنی توپوں کا بارود اپنے سینے میں دبا کے رکھا ہے۔ پچھلی دو دہائی میں اس حویلی کا دروازہ نہیں کھلا۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ حویلی کا دروازہ جب بھی کھلا... دروازے میں دبے ہوئے بارود کے پھٹ جانے کے امکانات پیدا ہوئے۔

حویلی کے مکین کب جاگتے تھے، کب سوتے تھے، کب روتے تھے کب ہنستے تھے!

گپ کھا لیتے تھے۔ اس بارے میں کوئی بھی کوئی حساب نہ رکھ پایا۔ جب کبوتر بڑی حویلی کی چھت سے اڑان لے کے بادلوں کے جھرمٹ کے پیچھے بھاگنے لگتا تھا تو کہنے والے کہتے تھے کہ حویلی کو سورج کی کرنوں نے چھو لیا۔

اس حویلی کے بارعب شخصیت جو ادھیڑ عمر تھے، عرف عام میں بڑی حویلی کے مالک تھے۔۔۔۔ صندل کی بنی ہوئی عصا کو تارکول کی سڑک پر ٹیکتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سفید رنگ کا کتّا حویلی کے صدر دروازہ کے پاس بیٹھ جاتا تھا، اور وہ ہر راہ گیر کو تجسس کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

حویلی کی زندگی شروع ہونے کی بس یہی ایک شہادت موجود تھی۔ بڑھا جب بہت رات گئے اپنے صندل کی عصا کو ٹیکتے ہوئے حویلی کے اندر چلا جاتا تو بلّی کی میاؤں میاؤں کی آواز آتی تھی۔ یہ آواز کسی سنسان ویران مسکن میں بسی ہوئی بد روح کی آواز لگتی تھی!

اس دن سورج نے اپنے آپ کو بادلوں میں چھپا دیا۔ پھر کچھ ہی وقت میں بادلوں نے بھی اشک ریزی شروع کی۔ یوں تو نہ جانے کتنی بار سورج نے بادلوں میں خود کو چھپا لینے کا آنکھ مچولی۔

کا کھیل کھیلا ہے... لیکن اس دن آسمان افسردہ تھا۔ آسمان اور افسردہ...!

دو دہائی کے اختتام پر بڑی حویلی کا دروازہ کھل گیا!!!

حویلی کے مشرقی دروازے پر ٹنگی ہوئی تصویر میں تابوتے میں کسی کی میت کو آدمیوں کی ایک بڑی تعداد لے کے جا رہی تھی... اُن آدمیوں میں میں بھی ایک تھا!

"یا اللہ...... یہاں میں کیسے! میں نے چونکتے ہوئے انداز میں اپنے آپ کو جگانے کی کوشش کی... لیکن وہاں بوندا باندی ہو رہی تھی...

آدمیوں کے اِس قافلے میں.... میں کیا صرف اکیلا انسان تھا یا کوئی اور بھی تھا... وہ... صندل کا عصا کہاں تھا؟ اب وہ بارعب شخصیت کہاں جا کر دفن ہو گئی..... آج وہ قدرے جھک گیا۔ کمر میں خم، آنکھوں میں سفیدی آگئی تھی!

آدمیوں کے اس قافلے میں صرف وہی آواز کیوں میرے کانوں میں پہونچی:

"ایک زمانہ تھا صاحب اِن کا۔ زمانے کی جان تھا۔ کیا آواز پائی تھا۔ آواز میں کیا لوچ تھا۔ کبھی سُنا ہے اِن کا گانا۔!"

جامع مسجد آ گئی... جنازہ کی نماز شروع ہوئی

اَللّٰہُ اَکبر ـــ اَللّٰہُ اَکبر ـــ

اَللّٰہُ اَکبر ....

جب ہم اس کو منوں مٹی کے نیچے سُلا کے آئے تو میرا پاؤں کیچڑ میں پھنس گیا میں نے پاس والی درگاہ شریف میں قبر میں سوئی ہوئی روح کے ساتھ لوہے کے پنجرے کے پاس کھڑا ہو کر تاک جھانک شروع کی۔

واپسی کا سفر بڑا کٹھن ثابت ہوا۔

میں بوڑھے سے کہتا ہوں ...

"تھک گئے ہوں گے آپ!"

"سلمیٰ... نیلوفر ... اندر ہیں۔"

آٹھ سال کی نیلوفر نے سلمیٰ سے کہا۔

"باجی ....! امی کہاں گئیں؟"

بوڑھی آپا نے سلمیٰ کے آنسوؤں کو پونچھ کر نیلوفر سے کہا:

"نیلوفر! ..... اب یہ تمہاری باجی نہیں امّی ہے۔"

بڑی دیر تک سکوت رہا۔ حویلی کا دروازہ اس لئے نہیں کھولا گیا کہ باہر کی روشنی سے اس کے مکینوں کی آنکھیں چکا چوند نہ ہو جائیں۔ حویلی میں قد نما شیشہ بھی تھا۔ زری کے تار سے بنا ہوا غرارہ کا سوٹ بھی تھا ان ایوننگ پیرس کی عطر بھی تھی۔ لیکن سلمیٰ کے بالوں میں چاندی آئی تھی ... آنکھیں روتے روتے اندھی ہو گئی تھیں ... آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہوئی تھیں ...!

اَب کس کا انتظار تھا.... تصویر اب بھی وہیں ٹنگی ہوئی تھی جہاں پہلے تھی۔

آج پہلی بار حویلی میں میلہ لگا ہوا تھا۔ شاہی قورمہ پک رہا تھا۔ دستر خوان بچھ رہے تھے.... دوڑنے کے سوا کسی کو کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

میرا! یہاں کیا کام ــــ؟ لیکن وہ میرا راستہ روکے ہوئے کہنے لگا:

"جانتے ہو..... نیلوفر.... سلمٰی کی بیٹی ہے!

شاہی قورمہ بٹ گیا..... دستر خوان اب اٹھایا جا رہا تھا۔ اَب تو سب تھک کر چور ہو گئے تھے.... چالیسواں ہو گیا۔ لوگوں نے تلاوت خوانی کے بعد رُخصت لی۔ اور اَب میں......

کتّے کی ٹانگوں میں بلّی نے اپنا بدن چھپا لیا۔ کبوتر دن بھر کی اڑان کے بعد بلّی کے ریشمی جسم پر سو گیا۔ اب تو بڑی حویلی کا بڑا دروازہ بھی بند ہو گیا۔



سو گئے داستاں کہتے کہتے

رات کے اندھیرے میں قبرستان کے کنارے ایک تنہا جھونپڑی سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیر زندگی کی واحد علامت تھی۔

وہ بھاگ رہی تھی۔ پھر اچانک اُس تنہا جھونپڑی کے سامنے رُک گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اُس کا سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں رعشہ تھا۔ اپنے آپ کو اعتدال پر لانے کی کوشش میں وہ جھونپڑی کا دروازہ پیٹنے لگی۔

جھونپڑی کا دروازہ ایک کالے ہیبتناک چہرا

والے قدآور شخص نے کھولا۔ وہ بے تحاشہ چیخنے لگی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

کالے شخص نے اپنی بھیانک آواز میں کہا:

"کیا چاہیئے؟"

وہ سہمی آواز میں بول پڑی:

"پناہ!"

کالے نے جھونپڑی کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کونے میں ایسے سُکڑ کے بیٹھ گئی۔ جیسے کسی نے دیوار پر تصویر ٹانگ دی ہو۔ کالے نے اُس کے سامنے ایک آدھی جلی روٹی اور چند پیاز کے ٹکڑے ڈالے۔

"کھاؤ!" کالے نے کہا۔

اس نے اپنی شکم پُری کرنے کے لئے وہ آدھی جلی روٹی اور چند پیاز کے ٹکڑے کھائے۔ پھر نیند کی کوشش میں نیند کی باہوں میں چلی گئی۔ اور نیند نے حقیقت کے اظہار کو داستاں بنا دیا۔

ناچتے ناچتے جب بھی اس کے پاؤں دُکھنے لگتے تب اس بوڑھے کا نحیف ہاتھ اس کے سر پر ہوتا۔ وہ مشکور نگاہوں سے بوڑھے کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہ جاتی۔

پھر ایک دن شہزادہ سلیم آگیا۔

شہزادے نے کہا:
"انارکلی! ... تمہارے پاؤں ناچتے ناچتے زخمی ہو گئے ہیں۔ میں ان پر مرہم لگا دوں گا۔"
انارکلی نے بے یقینی سے پوچھا۔
"شہزادے کہیں یہ خواب تو نہیں!"
بوڑھے نے اپنا مرجھایا ہوا چہرہ اور نحیف ہاتھ دونوں کو خاک کے اندر دفن کیا۔ وہ اچانک اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ لیکن وہ اپنے دل کو یقین دلاتی رہی کہ اس کا شہزادہ اس کے پاس ہے۔ وقت کے چرخ نے شہزادے کے چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ اس نے جس سچائی کی علم برداری کا حلف اٹھایا تھا، شہزادہ اس سچائی کو پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں نہ آئی ... اور بھاگتے بھاگتے قبرستان کی تنہا جھونپڑی میں پناہ گزیں ہو گئی۔
صبح کی کرنوں نے اسے جھونپڑی کے سناٹے میں واپس بلا لیا۔ اس نے کالے کو اپنے کندھے پر پھاوڑا رکھتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوال کیا۔
"کہاں جا رہے ہو؟"
"ایک اور آیا۔۔۔!" اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی !"

"اُبھی !" وہ پوچھ بیٹھا۔

"ہاں ابھی !.... میں ــــ ! اِس جھونپڑی کے سناٹے میں اکیلی رہ نہ پاؤں گی !"

"چلو...."

اُس نے اپنے کندھے پر ٹوکری رکھی۔ وہ کالے کے پیچھے پیچھے چلی۔ قبرستان کی بے شمار قبروں کو پار کرتے ہوئے وہ ایسی جگہ ٹھہر گئے جہاں ابھی کوئی قبر نہ تھی۔ وہ پھاوڑے سے زمین کھودنے لگا۔ وہ ٹوکری سے مٹی ہٹانے لگی۔ وہ ایک لمبی چوڑی گہری لحد بن گئی۔

لحد کے تیار ہوتے ہی چار اشخاص ایک لاش کو کندھوں پر اُٹھائے چلے آ رہے تھے، اُنھوں نے لاش کو زمین پر رکھا۔ اور اُن میں سے ایک نے کالے سے کہا۔

"لاش کو زمین کے حوالے کرو !"

کالے نے سر کے اشارے سے حامی بھری۔ وہ چاروں واپس چل پڑے ــ کالا لاش کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وہ زیرِ لب بول پڑا۔

"خوبصورت !"

لڑکی کی جھکی نگاہ کالے کے جملے کے ساتھ اس لاش کے چہرے پر پڑی، اس کے منہ سے دردناک چیخ نکل پڑی۔

کنوارے الفاظ کا جزیرہ

یہ جانتے ہوئے بھی کہ شیشے کے محل میں رہتا خود اپنے آپ کو تیر و نشتر کا نشانہ بنانا ہوگا۔ میں نے پھر بھی زندگی میں کچھ حاصل کرنے کی ٹھان لی۔

اچانک سب ایک خواب کی کیفیت میں تبدیل ہوتا رہا۔ اب میں رات کے اندھیرے میں اپنے آپ کا تعاقب کرتا رہتا ہوں۔ اس اندھیرے میں بار بار وہ آواز سنائی دیتی ہے۔ "یہ سب ڈھونگ کس لئے؟"

"کیا مطلب؟" میں بول پڑتا۔

"سوچ — ! — انجام —"

زندگی کی جو ساعتیں میں نے سکون کے لئے وقف کی تھیں اب ان ساعتوں میں بھی میں اپنے آپ کو سوچ و فکر کے زنداں میں قید پاتا ہوں۔ رات کے اندھیرے میں جب جب میری گہری نیند ٹوٹ جاتی ہے، میں اپنی بند مٹھی میں ایک جزیرہ پناہ گزیں پاتا ہوں۔ اور میں اس جزیرے پر ان کنوارے الفاظ کی شناخت کی جستجو میں لگ جاتا ہوں۔ جو مجھ میں جذب ہو کر بھی مجھ سے بہت دور ہے!





تعارف

برصغیر ہند جب آگ کے ہولناک شعلوں کے لپیٹ میں تھا۔ تب سرزمینِ کشمیر میں میری آنکھ کھلی۔ فکر کے ابتدائی سفر میں ہزار داستان سے ملاقات ہوئی۔ سوچ نے مجھ سے سوال کیا؟ ”کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔؟“

کالج کے رسالے پرتاپ میں اپنی انفرادیت کا راستہ تلاش کرنے کی جستجو شروع کی۔ اس کے بعد کب کیا نشر ہوا اور کہاں چھپا، اس کی بہت لمبی تفصیل ہے۔

سنہ ۱۹۷۱ء میں ”سڑک جا رہی ہے“ کشمیر کلچرل اکاڈمی کی معاونت سے چھپی۔ سنہ ۱۹۷۲ء کے ایام میں ماسٹر آف آرٹس کی ڈگری (ایم۔اے) حاصل کی لیکن یہ تو صرف ڈگری تھی۔ عملی دنیا نے جو حقیقتوں کے تھپیڑے میرے ذہن پر مارے اُن کا نچوڑ ”کنوارے الفاظ کا جنیہ“ [illegible]